وہ اک ستارہ مہرباں

سندس جبیں

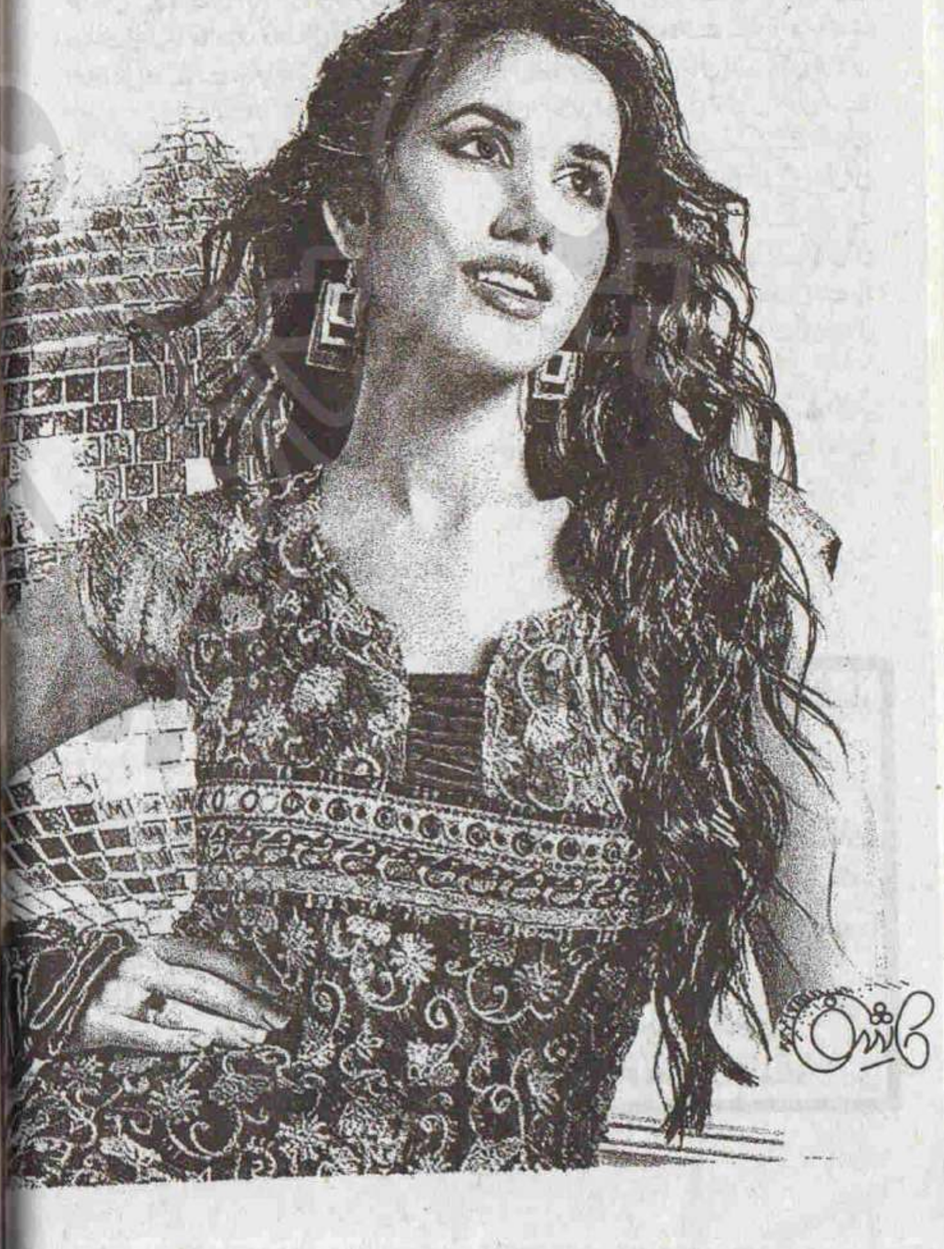

شیشے کی دیوار سے سر ٹکائے ہوئے، آنسو قطرہ قطرہ اس کی سنہری آنکھوں سے گر رہے تھے، شیشے کے اس پار ''وہ'' آئی سی یو میں تھا، نلکیوں اور پٹیوں میں جکڑا ہوا، جتنی بار اس کی نظر ''اس'' بے جان زرد پڑے چہرے پر جاتی نئے سرے سے اذیت سمیٹ لاتی، اس کی ٹانگیں مسلسل کھڑے ہونے کی وجہ سے بے جان سی ہو رہی تھیں مگر اسے یہاں سے دور جانا منظور نہ تھا سو وہ اسی طرح ساکت کھڑی رہی، جب ایک ہاتھ نرمی سے اس کے سر پہ آ کر ٹھہر گیا، اس نے تڑپ کر سر اٹھایا۔

''کب تک ادھر کھڑی رہو گی؟ آؤ میرے ساتھ۔'' سفید اوور آل کندھوں پہ ڈالے ادھیڑ عمر ڈاکٹر دانش نے اسے سمجھایا تھا، مگر وہ اسی طرح کھڑی رہی، بس کچھ کہے بنا سر ہلا دیا۔

''آ جاؤ لٹل گرل، مجھے تم سے کچھ بات کرنا ہے۔'' انہوں نے کہا، وہ چونک کر متوجہ ہوئی پھر سر ہلاتے ہوئے ان کے ساتھ چل پڑی، ان کے آفس میں آ کر وہ کرسی پر گر سی گئی مسلسل جاگتے ہوئے اسے اڑتالیس گھنٹے ہو چکے تھے، تھکن، پریشانی، خوف اور پچھتاوا مل کر اسے مزید کمزور کر رہے تھے، ڈاکٹر دانش نے چائے کے دو کپ منگوا لیے۔

گرم چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے اسے یاد آیا کہ آج سردی کس قدر عروج پر تھی، درجہ حرارت منفی سینٹی گریڈ پر پہنچا ہوا تھا، حالانکہ اسے سردی بہت پسند تھی، وہ پورا سال سردیوں کا انتظار کرتی تھی مگر آج اسے یہ سردی بہت بری لگ رہی تھی۔

''انکل! کیا آپ مجھے کچھ بتانا چاہ رہے تھے؟'' اس نے یاد آنے پہ پوچھا۔

''ہوں، تم جانتی ہو انہیں کیا ہوا ہے؟''

مکمل ناول

انہوں نے بہت افسردہ اور پریشان لہجے میں بتایا۔

''جی میں جانتی ہوں۔'' اس کے لبوں پہ سسکیاں تھیں۔

''مگر اس کی ریزن حیران کن ہے میں نہیں جانتا انہیں کیا پریشانی تھی؟ مگر یہ ایک بہت ہی اوور اسٹریسڈ اور پریشرائزنگ نروس بریک ڈاؤن ہے۔'' وہ لب کچلتی آنسو روکتی انہیں دیکھے گئی۔

''اگرچہ اب ان کی کنڈیشن پہلے جیسی تو نہیں مگر پھر بھی ہم انہیں بہتر نہیں کہہ سکتے، کم از کم مزید دو دن انہیں انتہائی نگہداشت کے وارڈ میں رکھنا پڑے گا۔'' انہوں نے کہا۔

اسے لگا جیسے سزا کا فیصلہ مزید دو دن آگے سرک گیا ہو، ڈاکٹر دانش اپنا اوورآل بازو پہ ڈالے باہر جا چکے تھے، اب کمرہ صرف اس کی سسکیوں سے گونج رہا تھا، کتنا پچھتاوا تھا اس کے آنسوؤں میں کتنے نوحے تھے اس کے لبوں پہ اور کتنے سارے کاش تھے اس کے دل میں، مگر اب کیا ہو سکتا تھا؟ اس کی مثال اس بڑھیا کی سی تھی جس نے ایک مضبوط رسی بٹی اور پھر اسے اپنے ہاتھوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

ہر گھڑی درد کی شدت سے سسکتی آنکھیں!!
اور اوپر سے تیرے وصل کے خوابوں کے عذاب
روز آنگن میں کھڑے پیڑ سے گرتے پتے
اور سر شام پرندوں پہ گزرتی آفات
نبض اور دل کی بغاوت سے تڑپتی ہے حیات
اس بڑے شہر میں بڑھتا ہوا لوگوں کا قحط
روز ہوتی ہے میرے ساتھ دیواروں کی جھڑپ
روز اک سانس کو پھانسی کی سزا ملتی ہے
اب تو آ جا اے میری جان کے پیارے دشمن
اب تو آ جا کہ تیرے ہجر کے قیدی کو یہاں
روز اس شہر میں مرنے کی دعا ملتی ہے

☆☆☆

''دیکھو تائب! مجھے یوں بار بار یہاں مت بلایا کرو، تم جانتے ہو یہ کتنا مشکل ہے۔'' گل رعنا از حد جھنجھلائی ہوئی تھی، جواباً وہ مسکراتا ہوا اس کے صبیح چہرے پہ نظریں گاڑ کر سلگتے ہوئے لہجے میں بولا تھا کہ۔

''تمہیں پتا ہے گل! میں تم پہ مرتا ہوں۔''

وہ کھل اٹھی، ایک بے اختیار مسکراہٹ نے اس کے لبوں کو چھوا تھا۔

''بس اسی قسم کی باتیں کرتے رہنا۔'' اس نے نخوت سے ناک سکوڑی۔

''تم کہو تو کوئی عملی قدم اٹھا لوں؟'' وہ بولا، لہجہ خاصا دھمکی آمیز تھا، گل دہل سی گئی۔

''کیسی باتیں کرتے ہو؟'' اس نے تائب کو گھورا۔

جواباً وہ پھر سے ہنس پڑا، ماحول میں رچی شام کی لالی دھیرے دھیرے دور دور تک پھیلے کھیتوں کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی، وہ اس وقت جس جگہ پہ کھڑے تھے وہاں دو جھولے لگے تھے جن پر سارا دن گاؤں کے بچے جھولتے رہتے تھے یہ ایک طرح سے ان کی پلے گراؤنڈ تھی، اس وقت ایک جھولے پہ گل بیٹھی تھی جبکہ لوہے کے مضبوط راڈ کے ساتھ کمر ٹکائے تائب کھڑا اس کے جھولے کو آہستہ آہستہ حرکت دے رہا تھا۔

''گل!''

''ہوں۔'' شام کی لالی اس کے عارضوں پہ دھنک بکھرا رہی تھی، وہ اپنی بات بھول کر مبہوت سا اسے دیکھے گیا، پتا نہیں وہ واقعی اتنی خوبصورت تھی یا اسے ہی لگتی تھی؟

''تم بہت خوبصورت ہو۔'' اس نے کہتے ہوئے ایک جذب کے عالم میں آنکھیں بند کر لیں، گل نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا اور زور سے ہنس دی، اس کی شفاف ہنسی بالکل ایسی ہی تھی جیسے کرسٹل ٹیبل پر ڈھیر ساری کانچ کی چوڑیاں گر کے بج اٹھیں۔

''میں سمجھی پتا نہیں کیا بات کرنے لگے ہو؟'' اس نے سر جھٹکا۔

''گل! ایک بات مانو گی؟'' اس کا لہجہ پرسوچ تھا۔

''ہوں...... بولو۔''

''میری بن جاؤ ناں۔'' وہ جذباتی ہو رہا تھا۔

''اچھا۔'' وہ ہنس دی۔

''تم ہنس کیوں رہی ہو؟''

''اور کیا کروں؟''

''میری بات کا جواب دو۔''

''تمہاری بات کا جواب......؟ تو اس کا جواب یہ ہے تائب چوہدری! کہ تم اپنی ماں کو ہمارے گھر بھیجو اور باقاعدہ طور پر مجھے اپنے نام لکھوا لو۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔

تائب قدرے چونکا پھر خاموشی سے کچی زمین کھرچنے لگا، ماحول میں چہچہاتے پرندوں کے شور کے سوا کوئی آواز نہ تھی۔

''میرے سوال کا جواب نہیں دیا تم نے؟'' وہ بولی۔

''کیا جواب دوں؟'' تائب کا لہجہ سپاٹ تھا۔

''اچھا۔'' وہ طنزیہ ہنسی پھر بولی۔

''اور خود تمہیں جواب لینے کی کتنی جلدی تھی تائب!''

''گل! میری ایک بات مان لو۔'' اس کا لہجہ بدل گیا۔

''کون سی بات؟'' اس نے زمین پر پیر ٹکاتے ہوئے جھولے کی حرکت روک دی۔

''آؤ میرے ساتھ۔''

''کہاں؟''

''آؤ بھاگ چلیں۔'' اس نے گل کا ہاتھ تھام لیا۔

''تائب!'' وہ ساکت رہ گئی۔

''ہمارے پاس اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں ہے۔'' تائب کے انداز میں کیا کچھ نہ تھا، محسوس کر کے گل دھک سے رہ گئی۔

''مگر میں......'' اس کے عارضوں کی دھنک ماند پڑ گئی۔

''اگر مگر کچھ نہیں گل!'' وہ پرعزم تھا، وہ نیم جاں ہونے لگی۔

''تائب! میرے گھر والے...... میرے بابا سائیں...... میرے لالہ؟'' وہ زرد پڑ گئی۔

''تو ٹھیک ہے پھر مجھے بھول جاؤ۔'' اس نے گل کا ہاتھ چھوڑ دیا۔

''تم سنجیدہ ہو؟'' وہ دنگ رہ گئی۔

''تو تمہارا کیا خیال ہے جھک مار رہا ہوں۔'' وہ سرد مہری سے بولا۔

''لیکن تم میری بات کیوں نہیں مان لیتے؟ بھیج دو ناں اپنے والدین کو۔'' وہ رو دینے کو تھی۔

''نہیں بھیج سکتا۔''

''کیوں؟'' وہ چیخ پڑی۔

''چلاؤ مت، تم اچھی طرح جانتی ہو یہ ممکن نہیں کیونکہ زرنیلا میری منگیتر ہے۔'' اس نے سختی سے کہا۔

''تو یہ سب کچھ میرے ساتھ وعدے وعہد کرنے سے پہلے سوچنا تھا نا؟'' وہ پھٹ پڑی، وہ عجیب سے انداز سے ہنس دیا۔

''یہ دل کے معاملے ہیں گل رعنا ملک!''

''تو پھر ایک بات میری بھی کان کھول کر

سن لو تائب چوہدری! جو تم چاہتے ہو وہ میں کبھی نہیں کر سکتی۔" اس نے کٹھور اور دوٹوک لہجے میں کہا اور تیزی سے واپسی کے لئے مڑ گئی، مگر اس کی آواز نے آگے بڑھتے قدم روک دیئے۔

"ایک بات میری کبھی یاد رکھنا گل رعنا ملک! تائب چوہدری کبھی ہارا نہیں۔"

وہ بھی تڑپ نہ جائیں تو اس عاشق پہ خاک
ہم سے فقط نگاہ ملانے کی دیر ہے......!

تائب چوہدری کی آواز اور اس کے لہجے میں نجانے ایسا کیا تھا کہ گل تھرا کے رہ گئی پھر وہ بھاگنے والے انداز میں وہاں سے نکلتی چلی گئی۔

☆☆☆

"قصر گل" میں زوریز ملک اور گل افشاں ملک رہتے تھے جن کے دو ہی بچے تھے، زرشام ملک اور گل رعنا ملک۔

گل رعنا نے مقامی اسکول سے میٹرک پاس کیا تھا اور اس کے بعد گھر میں ہی ہوتی تھی ان کے خاندان میں لڑکیوں کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کا رواج ہی نہ تھا جبکہ دوسری طرف زرشام انگلش میں ماسٹرز کرنے کے بعد اب لاہور سے ہی ایم فل کر رہا تھا، حالانکہ تھا تو یہ کھلا تضاد مگر روایتی باپوں کی طرح زوریز ملک بھی اس کی ضد کے آگے مجبور ہو گئے تھے، وہ چاہتے تھے کہ وہ زراعت میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرے مگر زرشام کو شروع سے ہی گاؤں اور اس کے گھٹے ماحول سے عجیب سی چڑ تھی جو کبھی کبھی بہت شدید ہو جاتی تھی، خاص طور پہ تب جب گاؤں کی پنچائیت عجیب وغریب بلکہ کسی حد تک گھناؤنے فیصلے کرتی، اکثر اس کا باپ سے اس بات کو لے کر جھگڑا بھی ہو جاتا تھا مگر وہ اسے سمجھا بجھا کر واپس اسے اس کی جگہ (لاہور) بھیج دیتے، "لال حویلی" میں، سلطان چوہدری اور سلمٰی چوہدری کا بسیرا تھا ان کے بھی دو ہی بچے تھے، تائب چوہدری اور زیمل چوہدری۔

تائب حال ہی میں زراعت میں ماسٹرز کر کے فارغ ہوا تھا اور آج کل کثرت سے گاؤں میں پایا جاتا تھا اور اس کی آوارہ گردی اسے "گل رعنا" سے ٹکرا گئی، دونوں میں جذبے بڑی تیزی سے پروان چڑھے تھے اگر وہ اس کے لئے دیوانہ تھا تو گل رعنا بھی اس کے لئے ساری پابندیاں توڑ کر اسے ملنے آتی تھی۔

دوسری طرف "زیمل چوہدری" ابھی صرف تیرا سال کی تھی اس کی اور تائب کی عمر میں دس سال کا فرق تھا اس کے درمیان ان کے دو اور بہن بھائی اوپر تلے پیدائش کے بعد فوراً بعد فوت ہو گئے تھے، زیمل اس وقت مقامی اسکول میں ساتویں جماعت کی طالبہ تھی، ان کے خاندانی رواج کے مطابق اسے مڈل تک پڑھایا جاتا تھا اور اس کے بعد چار پانچ سال تک جب اس کی عمر بمشکل سترہ سے اٹھارہ سال کی ہوتی اسے بیاہ دیا جاتا۔

یوں تو دونوں خاندانوں میں بظاہر کوئی چپقلش نہ تھی مگر چوہدری کو ملک فیملی سے خدا واسطے کا بیر تھا وہ انہیں زک پہنچانے کا کوئی موقع نہ ہاتھ سے جانے دیتے، یہ زوریز ملک کی امن پسندی ہی تھی کہ کبھی دونوں خاندانوں میں کوئی بڑا جھگڑا نہیں ہوا تھا اور نہ ہی کوئی قابل ذکر لڑائی۔

"سلطان چوہدری" گاؤں کی پنچائیت کے ایک اہم اور با اثر رکن تھے اور عموماً اہم فیصلوں میں ان کی بات کو ہمیشہ اولیت دی جاتی تھی، مگر اپنی فطری فسادی طبیعت کی بنا پر وہ ہمیشہ ہی بڑے سخت فیصلے کرتے تھے خاص طور پر اگر کوئی خون بہا یا ونی کا معاملہ آجاتا تو ان کی ساری ہمدردیاں متاثرہ فریق کے ساتھ ہوتی تھیں۔

جبکہ "زوریز ملک" ہمیشہ ہی ایسے معاملات سے دور رہے تھے دل ہی دل میں وہ بھی زرشام کے ہم خیال تھے اور ان غیر انسانی رسموں کے سخت خلاف تھے مگر چونکہ ان کا کوئی تعلق نہ تھا ایسے معاملات سے جبھی وہ ہمیشہ ان سب سے دور ہی رہے، آج کل وہ شدومد سے گل رعنا کی شادی کا سوچ رہے تھے۔

☆☆☆

بمشکل اسے ڈاکٹر دانش اس بات پر آمادہ کر سکے تھے کہ وہ تھوڑی دیر جا کر گھر میں ریسٹ کر لے وہ مان تو گئی تھی مگر صرف ایک گھنٹہ ریسٹ پر، ڈرائیور اسے لے کر گھر آیا تو وہ تھکے قدموں اور بوجھل دل کے ساتھ نم پلکیں لئے اندر کی طرف بڑھ گئی، وسیع وعریض گھر جیسے سنسان گھاٹ بنا ہوا تھا، لاؤنج سے گزرتے ہوئے اس کی نظر اس مخصوص گوشے پر پڑی تھی جہاں وہ اکثر بیٹھا کرتا تھا، کوئی نہ کوئی کتاب پکڑے اور کبھی کبھار ٹی وی پر نظریں جمائے کسی نیوز چینل کو سرچ کرتے۔

سوچتے ہوئے وہ لرزتی ٹانگوں سے اندر کی طرف بڑھ گئی، بیڈ پہ بیٹھتے ہی اس کی نظر سائیڈ ٹیبل پہ دھری ہاشم ندیم کی "خدا اور محبت" پہ پڑی، اس کے اندر کہیں درد مزید بڑھ گیا تھا، یہ کتاب اسے برتھ ڈے پہ گفٹ کی تھی اس نے، بیڈ پہ چت لیٹتے ہوئے اسے احساس ہوا تھا کہ وہ کس قدر تھکی ہوئی تھی، فوراً ہی اس کی آنکھیں بند ہو گئیں، چند لمحوں بعد ہی وہ نیند میں جا چکی تھی، اگرچہ اس کی نیند بڑی بے چین اور تکلیف دہ تھی، بار بار وہ کروٹ بدلتی اور پھر ڈراؤنے خوابوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا، پہلے اس نے دیکھا وہ کسی تاریک کمرے میں تھی جس کی کوئی کھڑکی کوئی روشندان اور دروازہ نہ تھا اور وہ پاگلوں کی طرح چلاتی ہوئی ہر دیوار پر ہاتھ مار مار کر رہائی کا کوئی راستہ ڈھونڈ رہی تھی، پھر اس نے دیکھا کہ بہت عجیب سی جگہ تھی ہر طرف بڑے بڑے درخت تھے اور اتنے گھنے کہ یہ گمان کرنا مشکل تھا کہ سورج کا گزر وہاں سے تھا کہ نہیں وہاں بھی سخت ویرانی اور گھور اندھیرے میں وہ ٹھوکریں کھاتی آگے بڑھ رہی تھی پھر یکلخت وہ بھاگتے بھاگتے جیسے کسی گہری کھائی میں جا گری، نیچے بس آگ اور خون تھا اور یہ سب اس قدر خوفناک اور دل دہلا دینے والا تھا کہ وہ ایک دلدوز چیخ مارتی اٹھ کر بیٹھ گئی اس کا سارا چہرہ پسینے سے بھیگا ہوا تھا اور حلق جیسے خشک صحرا، اس نے جلدی سے سائیڈ ٹیبل پر پڑے جگ میں سے پانی گلاس میں نکالا اور ایک ہی سانس میں چڑھا گئی، پھر وہ تیزی سے بستر سے اتری اور چپل پہن کر بھاگنے والے انداز میں باہر آ گئی، اسے ابھی ہوسپٹل جانا تھا۔

کچھ ہی دیر میں اس کی گاڑی جیسے اڑی جا رہی تھی اور وہ بار بار ڈرائیور کو مزید تیز چلنے کا کہتی، ہوسپٹل پہنچنے پر اسے ڈاکٹر دانش کہیں نظر نہیں آئے وہ تیزی سے آگے بڑھتی اس کے کمرے میں پہنچ گئی۔

وہ اسی طرح بیڈ پر دراز تھا، اس کا لمبا چوڑا شاندار سراپا پورے بیڈ پہ بکھرا ہوا تھا اور وہ آنکھیں بند کیے موت سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا، اس کے دل کو کچھ ہوا، وہ تیزی سے آگے بڑھی اور نزدیکی کرسی کو اس کے بیڈ کے قریب احتیاط سے رکھتے ہوئے اس کے پاس بیٹھ گئی، پھر اس کا ڈرپس میں جکڑا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام کر رو دی، بہت خاموشی سے بنا کوئی آواز کیے اس کے کتنے ہی بے تاب آنسو رخساروں پہ بہتے چلے گئے۔

"میں اس قابل نہیں تھی کہ آپ میرے

لئے اتنا کچھ کرتے۔" اس کی مدھم سرگوشی زمانوں کی تھکن اور تڑپ سمیٹے ہوئے تھی۔

☆☆☆

آنے والے بہت سارے دن اس کی ملاقات تائب چوہدری سے نہیں ہوئی تھی، وہ اندر سے سخت بے چین اور بے حال تھی مگر ظاہری طور پر اسی طرح ہنستی کھلکھلاتی "قصر گل" میں روشنیاں بکھیر رہی تھی، آج تو گھر میں خصوصی تیاریاں ہو رہی تھیں، لاہور سے زرشام ملک تین دن کے لئے آ رہا تھا، گل افشاں ملک جیسے ہوا کے گھوڑے پہ سوار تھیں، کبھی ہدایات دیتی یہاں پائی جاتی تو کبھی وہاں، وہ ان کا اکلوتا بیٹا تھا جس سے انہیں بے تحاشا پیار تھا، آج انہوں نے خود اس کے لئے اپنے ہاتھوں سے اس کی پسند کا مٹن پلاؤ اور روسٹ بھی تیار کی تھی، اس وقت وہ ملازماؤں سے اس کے کمرے کی سیٹنگ ٹھیک کروا رہی تھیں، وہ نہیں چاہتی تھیں کہ کہیں بھی کوئی کمی رہے کیوں کہ وہ کون سا روز روز آتا تھا؟ کبھی کبھار تو اس کا دل چاہتا تھا آنے کو۔

جب اس کی پجارو نے "قصر گل" کا مرکزی گیٹ پار کیا تو افشاں ملک کا سیروں خون بڑھ گیا تھا، گاڑی رکی اور پھر دروازہ کھول کر وہ باہر آ گیا، زوریز ملک نے بڑھ کر اسے بازوؤں میں بھینچ لیا تھا۔

"کیسا ہے میرا شہزادہ؟"

"میں ٹھیک ہوں بابا! آپ کیسے ہیں؟" اس نے بھی ان کے گرد اپنے مضبوط بازوؤں کا حلقہ بنا لیا۔

"ویسا ہی ہوں جیسا ایک باپ اپنے اکلوتے بیٹے کی جدائی میں ہو سکتا ہے۔" ان کا لہجہ بوجھل ہو گیا۔

زرشام طویل سانس لیتے ہوئے پیچھے ہٹ گیا، پھر گل افشاں ملک آگے بڑھیں تو وہ ان کے ملنے لگا، گل رعنا نے صرف دور سے ہی سر جھ کر سلام کیا تھا وہ بھی سرسری سا اس کے سر پ ہاتھ رکھ کر اندر کی طرف بڑھ گیا۔

اس کی پشت کو دیکھتے ہوئے گل رعنا کی آنکھیں کسی گہری سوچ میں نظر آ رہی تھیں، کھانے کی میز پہ وہ سب آپس میں محو گفتگو تھے جبکہ وہ بالکل خاموش تھی، افشاں ملک خوش دلی سے ڈشز اٹھا اٹھا کر زرشام کے سامنے رکھ رہی تھیں، جواباً وہ دھیما سا مسکراتے ہوئے سب میں سے تھوڑا تھوڑا چکھ رہا تھا جس پر افشاں خاصی تنقید کر رہی تھیں کہ وہ ذرا بھی خوش خوراک نہیں رہا، گل بڑی سرد نظروں سے لاڈ کے یہ مظاہرے دیکھ رہی تھی، اس کے ہاتھ سست روی سے پلیٹ میں چمچ چلانے میں مصروف تھے، پھر اس نے یہ اکتا دینے والا مرحلہ چھوڑا اور کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اماں جان! میں جاؤں۔" اس نے بڑے دھیمے لب و لہجے میں پوچھا وہ نہیں چاہتی تھی کہ زرشام اسے نوٹس کرے۔

افشاں نے بنا اس کی طرف دیکھے صرف سر ہلا کر جانے کا اشارہ کر دیا، اس کا رنگ بدل گیا، وہ لب بھینچے تیز تیز قدم اٹھاتی اندر کی طرف بڑھ گئی۔

کھانے کے بعد اب زوریز ملک اس کے ساتھ بیٹھے شکار کا پروگرام بنا رہے تھے جبکہ وہ ہمیشہ ہی اس قسم کے تشدد پسندانہ وحشیانہ مشاغل سے دور رہتا تھا تبھی اس نے صاف طور پر جانے سے نہ کر دی تھی، ویسے بھی افشاں ملک نے اسے یہاں ایک انتہائی ضروری کام سے بلایا تھا اور کام یہ تھا کہ گل رعنا کے لئے خاندان کے دو تین گھروں سے شادی کا پیغام آیا تھا، وہ چاہتی تھیں

وہ باپ کے ساتھ مل کر کوئی ایک گھرانہ دیکھ ال کر منتخب کر لے، کچھ دیر اسے منانے کے بعد ریز نے ہار مان کر موضوع گفتگو بدل دیا، اب افشاں ملک کی عین خواہش کے مطابق یہ جتے تھے اور اسے بتا بھی رہے تھے کہ ان کے اتھ مل کر بہن کی بات تو فائنل کرے گا ہی مگر س کے ساتھ ساتھ اپنا بھی کچھ سوچ، جواباً وہ ے جاندار انداز میں مسکرایا تھا۔

"آپ جانتے ہیں بابا! شادی میری زندگی یں سب سے آخر میں ہے۔" وہ اس کی عجیب سی ات سن کر حیران رہ گئے۔

"یہ کیا بات ہوئی زرشام! کہنا کیا چاہتے ہو؟"

"کچھ نہیں بس یہ کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا ابا جان! میں شادی ضرور کروں گا اور آپ کی رضی کی ہی کروں گا مگر ابھی نہیں۔" وہ سنجیدگی سے بولا۔

"مگر بیٹا! یہی تو عمر ہوتی ہے شادی کی۔" افشاں اپنی حیرانی نما پریشانی چھپا نہیں سکی تھیں، وہ ہلکے سے ہنس پڑا۔

"ارے نہیں اماں جان! شادی کسی بھی عمر میں ہو سکتی ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے بیٹا! ہونے کو تو سب کچھ ہو سکتا ہے مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم شادی بھی پچاس سال کے ہو کر کرنے کا سوچو۔" انہوں نے قدرے خفگی سے کہا۔

"ارے بیگم! کمال کرتی ہیں، کون ہونے دے گا اسے پچاس سال کا؟ کوئی اچھی سی لڑکی دیکھیں اس کے لئے اور بات کریں۔" زوریز ملک نے شد و مد سے اپنی تجویز دی تھی۔

"پلیز، بابا جان! شادی میری Aims کی لسٹ میں سب سے آخر میں ہے اور یقین رکھیں کہ جب بھی میرا موڈ ہوا آپ کو سب سے پہلے انفارم کر دوں گا۔" وہ اکتا سا گیا تھا مسلسل خود کو موضوع گفتگو بنا دیکھ کر، اس کا موڈ دیکھ کر زوریز ملک نے بات بدل دی۔

مگر وہاں بیٹھا کوئی بھی شخص یہ نہیں جانتا تھا کہ تقدیر "انہونی" کا دوسرا نام ہے اور بندوں کی سوچیں ان کے ارادے اپنے حساب کتاب سے ہوتے تھے جبکہ رب عظیم اس پابندی سے مبرا ہے، وہ جب چاہے جو چاہے کر سکتا ہے، وہ تین نفوس "قصر گل" کی طرف بڑھتی ہوئی تباہی سے بے خبر تھے۔

☆☆☆

اس نے اپنی خاص ملازمہ کے ہاتھ تائب چوہدری کو پیغام بھجوایا تھا کہ وہ اسے ملنا چاہتی ہے اور اسی شام وہ بڑی راز داری سے اپنے مخصوص مقام پر موجود تھی، آج وہ جھولے پہ بیٹھنے کی بجائے کھڑی تھی، موسم بھی سردی کی شدت بتدریج بڑھتی جا رہی تھی اس وقت بھی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے دھند اور کہرا آسمان سے برس رہا تھا، تائب بہت خاموش اور وہ بھی، ہر طرف سناٹے کا راج تھا۔

"مجھے تم سے ضروری بات کرنا تھی تائب!" کچھ دیر بعد وہ بڑی گہری اور فیصلہ کن آواز میں بولی تھی۔

"ہاں...... کہو...... کیا سوچا تم نے؟" تائب کا لہجہ بھی سوالیہ تھا، وہ کچھ دیر خاموش رہی جیسے الفاظ جمع کر رہی ہو۔

"بابا سائیں اور لالہ میری بات طے کرنے والے ہیں۔" اس نے بمشکل لفظ جوڑے تھے، دھماکہ اتنا شدید تھا کہ وہ ہل کر رہ گیا۔

"یہ اگر مذاق ہے تو بہت گھٹیا ہے گل؟" اس نے طیش میں آتے ہوئے کہا۔

"یہ حقیقت ہے۔" وہ چبا چبا کر بولی، تائب گنگ سا اسے دیکھتا رہ گیا۔

"میری بات سنو گل!" اس نے جارح انداز سے اس کے بازو کو جھٹکا دیا تھا۔

"تائب! بدتمیزی مت کرو۔" گل رعنا نے ایک جھٹکے سے بازو چھڑوایا تھا۔

"میں تمہیں یہ نہیں کرنے دوں گا۔" وہ چلایا تھا۔

"میں کچھ نہیں کر سکوں گی، تمہیں کرنا ہے جو بھی کرنا ہے۔" وہ تیز لہجے میں بولی۔

"تو پھر میری بات مان لو گل۔"

"نہیں تائب! ...... میں ...... یہ راستہ ...... نہیں ...... یہ صرف ذلت ہے۔" وہ ہکلا گئی تھی اور کمزور پڑ گئی تھی۔

"میں تمہیں بھگا نہیں رہا گل! میں تمہیں اپنے گھر لے کر جاؤں گا، میرا گھر، جس کا میں وارث ہوں "لال حویلی" کا اکلوتا وارث۔" اس نے ایقان کی ڈور گل کے ہاتھوں میں تھما دی، وہ بے یقینی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

"تم سچ کہہ رہے ہو تائب!"

"بالکل سچ۔"

"تم میرے ساتھ ...... دھوکہ ......" وہ رک گئی، تائب نے اس کی بات قطع کر دی۔

"قطعاً نہیں، سوچنا بھی مت، میں تم سے پیار کرتا ہوں گل رعنا! اور یہ محبت نا، زندگی میں بس ایک ہی بار ہوئی ہے کسی خاص سے، میرے لئے وہ تم ہو، میں تمہیں کسی بھی قیمت پر کھونا نہیں چاہتا۔" گل نے اس کے الفاظ سے پھوٹتی سچائی کو پوری طرح محسوس کیا تھا، وہ جیسے کسی ٹرانس کی سی کیفیت میں آتی جا رہی تھی۔

"تم مجھے چھوڑ دو گے تو نہیں۔" وہ شکوک میں مبتلا سی بولی تھی۔

"تائب چوہدری مرد ہے گل اور یہ ایک مر... کی زبان ہے جس سے پھرنے سے بہتر میں مر... جانا پسند کروں گا۔" اس نے شدت پسندی کی انتہ... کر دی تھی۔

"تائب! ...... میں ......" آنسو اس کی آوا... پہ غالب آ گئے۔

فیصلہ کرنا آسان نہیں تھا، ایک طرف اکیس سال تک پھولوں کی مانند رکھنے والے والدین تھے اور دوسری طرف آئندہ آنے والے سال گلستان بنا دینے کا دعوے دار، وہ جیسے کسی دوراہے پہ کھڑی تھی، چند لمحے گزر گئے، پھر اس نے سوچا۔

"خوش قسمتی دروازے پہ ایک ہی بار دستک دیتی ہے اور ہم اس کی دستک کو نظر انداز کر دیتے اور پھر ساری زندگی پچھتاتے ہیں۔" اس نے اپنے دروازے پہ دی جانے والی دستک کو نظر انداز نہیں کیا تھا، کیونکہ وہ پچھتانا نہیں چاہتی تھی، اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے اپنا ہاتھ تائب کے ہاتھ میں تھما دیا۔

☆☆☆

زمین پہ آگ تھی تارے لہو میں لتھڑے تھے
ہوا کے ہاتھ میں خنجر تھا اور پھولوں کی
پھٹی پھٹی ہوئی آنکھوں میں ایک دہشت تھی
ارادے ٹوٹتے جاتے تھے اور امیدیں
حصار دشت میں بکھری تھیں اس طرح جیسے
نشان بھٹکے ہوئے قافلوں کے رہ جائیں

اس کے لئے بھی زمین "سرد جہنم" بن رہی تھی اور اس کی خوفزدہ نگاہیں ایک موہوم اور درد ناک انتظار میں اس چہرے کو تکتی تھیں جیسے کوئی معصوم ہرن کسی جال سے بچنے کی اپنی سی کوشش کرتا ہو، وہ یہ تو چاہتی ہی تھی کہ اسے جلد از جلد ہوش آ جائے، ایک بار اسے دیکھے پھر چاہے...

...بھی ہو، جو سزا وہ اسے دے گا وہ قبول کر لے گی، بلکہ اس نے تو یہ تک سوچ لیا کہ وہ اسے کہے گی کہ:

"خدا کے لئے مجھے اپنے ہاتھوں سے مار ڈالو مگر آنکھیں تو کھولو، مجھ سے بات تو کرو، خواہ برا بھلا ہی کہو۔"

مگر وہ تو جیسے سارے عالم سے بے خبر تھا، ...ب سے بیٹھی اس کے چہرے پہ نظریں جمائے ...ئے تھی اس کے نیم والبوں پہ کتنی ہی دعائیں ...ل رہی تھیں جو عرش بریں سے مقبولیت چاہتی ...یں اور بے بسی اور کچھ نہ کر سکنے کا احساس اسے ...ے دے رہا تھا۔

ڈاکٹر دانش کا بلاوا آیا تو وہ سسٹر کے ساتھ ...کر چل دی اور اب وہ ان کے آفس میں ان کے سامنے بیٹھی منتظر تھی کہ وہ کچھ کہیں۔

"آپ نے بلایا تھا انکل!" اس نے انہیں ...لایا۔

"ہاں۔" انہوں نے طویل سانس لے کر ...سے دیکھا۔

وہ سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی، وہ ...ے آگے کو جھک آئے، ٹیبل پہ کہنیاں ...تے ہوئے جو انہوں نے کہا وہ ازحد حیران کن ...کسی حد تک پریشان کن بھی تھا، وہ اس کے ...بلانا چاہتے تھے، اس نے بے ساختہ نفی میں ...دیا۔

"آئم سوری انکل! مگر میں کبھی بھی آپ کی ...نہیں مان سکتی اور ان کی اجازت کے بغیر تو ...گز نہیں۔" اس نے دوٹوک کہا۔

"مگر بیٹا! اس میں میرا مفاد کسی طور شامل ...بلکہ میں تو......" اس نے تیزی سے ان کی ...ٹ دی۔

"میں جانتی ہوں انکل! مجھے آپ کے خلوص پہ بالکل شبہ نہیں ہے مگر میں مجبور ہوں، انہیں ہوش کب تک آئے گا؟"

"ایک گھنٹے تک۔" اس نے آنکھیں بند کرتے ہوئے اپنا ہاتھ تائب کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"ٹھیک ہے پھر آپ انہی سے پوچھ لیجئے گا، میں ذرا تب تک ان کو دیکھ آؤں۔" وہ اٹھ گئی، واپس اس کے کمرے کی طرف آتے ہوئے اس کی دھڑکن بڑھ رہی تھی اور قدموں میں لرزش سی آ گئی تھی، دوبارہ اسی کرسی پہ بیٹھتے ہوئے اس نے سوچا کہ کاش اسے اس کے الفاظ سنائی دے جائیں، وہ اس کے بیڈ پہ سر رکھ کے دھیرے دھیرے بڑبڑانے لگی۔

"میں نے اپنی ساری تصویروں کو آگ لگا دی ہے اور سارے آئینے تڑخا دیئے ہیں اور اپنی انا کو دل کے قبرستان میں دفنا دیا ہے جہاں سے وہ کبھی واپس نہ آ سکے گی، تمہاری مسکراہٹ میں نے کھو دی ہے اور میری حیثیت اس وقت جوئے باز کی سی ہے جس نے بازی کھیلی اور سب گنوا دیا لیکن نہیں، ٹھہرو ابھی بہت کچھ باقی ہے داؤ پر لگانے کے لئے، اب میں حاضر ہوں، ہاں...... وہی جو میں کہہ رہی ہوں، درست ہے، میں اپنا آپ داؤ پہ لگانا چاہتی ہوں، آؤ اور میری قیمت لگاؤ اور مجھے مصلوب کر دو۔" آنسو حقیر کیچوؤں کی طرح اس کی آنکھوں سے رینگتے رہے اور ماتم جاں جاری رہا۔

☆☆☆

ایک سرد دوپہر نے "قصر گل" کا احاطہ کیا ہوا تھا، سورج نے آج صبح سے صورت نہیں دکھلائی تھی اور ہر چیز جیسے سردی کی شدت سے ٹھٹھری ہوئی تھی، زوریز ملک نے بیٹے کے ساتھ مل کر آخر کار ایک رشتے کو فائنل کر دیا تھا، آج

شام وہ ان کے گھر جا رہے تھے، رشتہ فائنل کرنے کے لئے، زرشام ماں کے کمرے میں آیا تو کافی دیر بیٹھا رہا، آج رات کو یوں بھی وہ واپس جا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ یہ کہتے ہوئے اٹھ گیا کہ کچھ دیر رعنا کے پاس بیٹھ جائے پھر شاید جلد ملاقات نہ ہو سکے، وہ اس کے کمرے کی طرف بڑھ گیا مگر یہ کیا؟ وہ تو تھی ہی نہیں، کمرہ خالی تھا، وہ واپس افشاں ملک کے کمرے کی طرف بڑھ آیا۔

''اماں جان! رعنا کدھر ہے؟''

''اپنے کمرے میں تھی۔'' وہ حیرانی سے گویا ہوئیں۔

''نہیں، وہاں نہیں ہے۔''

''اچھا...... آؤ میں دیکھتی ہوں، ادھر ہی ہو گی، اس نے کہاں جانا ہے بھلا؟'' وہ اس کے ساتھ چل پڑیں۔

بے بسی کبھی کبھی موت سے بھی زیادہ ظالم ہوتی ہے، موت کبھی کبھی اپنے ہونے پہ روتی بھی ہے، اعتماد کا نازک شیشہ، جب ٹوٹتا ہے تو باقی کچھ نہیں بچتا۔

''قصر گل'' کی لاڈلی بیٹی روایتوں اور عزتوں کو روندتے ہوئے پنجرہ توڑ کر جا چکی تھی، ایک ہولناک آتشزدگی ہوئی تھی، زوریز ملک کے وجود میں، جس نے انہیں جھلسا کر رکھ دیا تھا، وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ۔

''اس کو غائب کیا گیا تھا؟''

یا

''وہ غائب ہو گئی تھی؟''

پورے گاؤں میں خبر جنگل میں آگ کی مانند پھیل گئی تھی اور پھر زیادہ دیر نہیں گزری تھی جب زوریز ملک کے پرسنل نمبر پہ ایک فون آیا تھا جس نے ان کے پیروں کے نیچے سے زمین نکال دی تھی، لال حویلی سے آنے والی، یہ فون ''سلطان چوہدری'' کی تھی، گل رعنا اور تا... چوہدری کا نکاح ہو چکا تھا۔

☆☆☆

''تائب چوہدری'' اسے لے کر س... ''لال حویلی'' گیا تھا جہاں گل کو اس کے س... دیکھ سلطان چوہدری پہلے تو گنگ رہ گئے مگر... بیٹے سے ایک طویل بحث کے بعد ان کے ... نے ایک شیطانی منصوبہ تشکیل دینا شروع کر... جبکہ اسے منصوبے سے تائب سلطان بے خبر ت... انہوں نے فوراً کچھ احکامات جاری دیئے جن میں سرفہرست ''لال حویلی'' کی سجا... اور ایک بھرپور جشن کی تیاری کا حکم تھا، وہ چاہتے تھے کہ کہیں بھی کوئی کمی رہے آخر تائب ان کے اکلوتے بیٹے کی شادی تھی، جبھی وہ حد... زیادہ پرجوش تھے، دوسری طرف سلمیٰ چو... اپنے شریک حیات کی اس ''اوورا ایکسائٹمنٹ... کچھ کچھ سمجھ رہی تھیں، شاید وجہ یہ ہو کہ وہ ا... فطرت کو جانتی تھیں۔

بھلا وہ زوریز ملک نیچا دکھانے اور... کرنے کا یہ نادر موقع کیوں ہاتھ سے ... دیتے؟

''گل رعنا'' انہیں دلی طور پر پسند آئی... از کم وہ اس زرنیلا سے تو بہتر تھی جو صر... پڑھ ہی نہ تھی بلکہ بدتمیز و گستاخ بھی تھی،... گھنٹے کے اندر ہی حویلی میں دیگیں کھڑ... جانے لگیں، مہمانوں کو فوری طور پر سندیس... بلا لیا گیا، ان کی بھانجی گل رعنا کو دلہن بنا... مصروف ہو گئی، سلمیٰ بیگم نے اس کے لئے... سارے زیوارت نکال کر رکھ دیئے تھے۔

دوسری طرف تائب بھی باپ کی... خوشی اور رضامندی پہ از حد خوش تھی، اس...

...میں باپ کی قدر و اہمیت مزید بڑھ گئی تھی، حویلی کی تیاریاں دیکھ کر وہ ہکا بکا سا تھا اس نے سوچا بھی نہیں تھا کہ یوں ہو گا؟ ایک شاندار جشن تھا، جس میں گل رعنا ہمیشہ کے لئے اس کی بنا دی گئی، ...ب سلطان چوہدری نے بھرے پنڈال میں سارے گاؤں کے سامنے یہ معمہ حل کیا کہ۔

''زوریز ملک کی گمشدہ بیٹی ہی میرے بیٹے تائب سلطان کی بیوی ہے اور مجھے فخر ہے کہ وہ تائب کے لئے اپنے باپ اور ''قصر گل'' کو ٹھوکر ...ار کر چلی آئی ہے اس خوشی میں، میں اپنی حویلی کا ...ام ''لال حویلی'' سے بدل کر ''گل کدہ'' رکھنے کا ...علان کرتا ہوں۔''

ہجوم پہ ایک سناٹا طاری تھا، پھر دبی دبی ...رگوشیاں اٹھنے لگیں، اسی اثناء میں سلطان ...ہدری فون کان سے لگاتے اپنے کمرے کی ...رف بڑھ گئے، انہیں زوریز ملک کو یہ خوشخبری ...انا تھی اور انہوں نے ایسا ہی کیا، بڑے طنزیہ اور ...تیرانہ لہجے میں انہوں نے زوریز ملک کو سب ...کھ بتا دیا اور پھر فون بند کرنے سے پہلے بڑے ...تے ہوئے اور زہریلے لہجے میں کہا تھا انہوں ...نے۔

''بڑے افسوس کی بات ہے ملک! تم سے ...ک بیٹی بھی نہ سنبھالی گئی۔'' اس کے بعد انہوں ...نے فون بند کر دیا۔

وہ اس بات سے قطعی بے خبر تھے کہ خدائی ...میں بات کرنے سے کوئی خدا نہیں بن جاتا ...رب کریم فرماتا ہے۔

''غرور میری چادر ہے جس نے اسے کھینچا، ...اسے رسوا کر دوں گا۔'' وہ لاعلم تھے کہ جس ...کو وہ زوریز ملک کی جھولی میں ڈال کر جشن ...رہے تھے ویسی ہی ذلت و تذلیل کا ایک طوق ...کے گلے میں پڑنے والا تھا۔

☆☆☆

ہم ایک راہ پہ چلتے تو کس طرح چلتے
تری زمین کسی اور ہی مدار میں تھی
میرا ستارہ کسی اور آسمان میں تھا
ہم ایک دوجے سے ملتے تو کس طرح ملتے
سمے کا تیز سمندر جو درمیان میں تھا

وہ اس کے ہوش میں آنے کی منتظر تھی، کب سے پلکیں بچھائے اس کی صورت تک رہی تھی، چاہتی تھی کہ وہ آنکھیں کھولے اور سب سے پہلے اسی کو دیکھے اور پھر اس سے منہ موڑ لے، پتا نہیں وہ اتنی اذیت پسند کیوں ہو رہی تھی؟ اس نے مضبوطی سے اس کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں جکڑ لیا۔

''شاید آخری بار۔'' اس نے نم آنکھوں سے سوچا۔

اس کے ہاتھ نے دھیمے سے حرکت کی تھی وہ تڑپ کر سیدھی ہوئی اور اس پر جھک گئی، اس کی پلکیں لرز رہی تھیں پھر وہ کھل گئیں اور سب سے پہلے وہ نگاہ اس کے چہرے سے ٹکرائی تھی۔

''زیمل!'' اس کے خشک ہونٹوں سے اس کا نام کسی صحیفے کی طرح ادا ہوا تھا، زیمل کے لبوں سے کراہ سی نکل گئی، وہ اس کا ہاتھ تھام کر ہچکیوں کے ساتھ رونے لگی۔

''مجھے معاف کر دیں۔'' اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتا ڈاکٹرز کا پینل اندر آ گیا۔

''انکل! پلیز مجھے بات کرنے دیں...... مجھے......'' وہ مچلتی روتی ان سے کہہ رہی تھی مگر ڈاکٹر دانش نے نرمی سے اسے باہر کی طرف دھکیل دیا، وہ کوریڈور کی دیوار سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''اب وہ مجھ سے کبھی بات نہیں کریں گے، مجھے ان سے معافی تو مانگ لینے دی ہوتی انکل!

یہ آپ نے کیا کیا؟" وہ روتے ہوئے بڑبڑا رہی تھی۔

☆☆☆

"قصر گل" میں جیسے موت کا سناٹا طاری تھا، گل افشاں ملک کو بار بار غشی کے دورے پڑ رہے تھے، زرشام ان کی پٹی سے لگا بیٹھا تھا، جبکہ زوریز ملک تب سے مسلسل کمرہ بند تھے، گھر میں تقریباً سبھی رشتہ دار اکٹھا ہو چکے تھے، جن میں سر فہرست تبریز چچا تھے جو کہ بالآخر زوریز ملک کو منا لینے کے بعد خود بھی ان کے ساتھ بند کمرے میں خدا معلوم کون سی خاص گفتگو میں مصروف تھے۔

"یہ ناممکن ہے تبریز! کہ میں یہ بھول جاؤں۔" وہ جیسے خون کے گھونٹ پی رہے تھے۔

"چوہدری وہاں پہنچے گا، کوئی نہ کوئی فیصلہ ہو جائے گا۔" تبریز نے کہا۔

"یہ ذلت میری برداشت سے بہت بڑھ کے ہے، میں اس بات کو ایسے نہیں چھوڑوں گا۔" ان کی آنکھوں میں انتقام کی سرخیاں اتر رہی تھیں۔

"تو پھر کیا سوچا ہے آپ نے؟ گل رعنا کی واپسی کا مطالبہ کریں گے؟"

"میں تمہیں احمق نظر آتا ہوں؟" وہ بھڑک اٹھے۔

"وہ اپنی مرضی سے گئی ہے وہاں، اب تو لازماً وہ اسے ذہنی طور پر اس بات کے لئے تیار کر چکے ہوں گے کہ وہ پنچائیت کے سامنے یہی ظاہر کرے کہ وہ اپنی مرضی سے آئی ہے اور ویسے بھی اس کے واپس آنے سے کون سا یہ ذلت و تذلیل عزت میں بدل جائے گی، اس لئے میں کچھ اور سوچ رہا ہوں۔"

"کیا؟"

"میں ان سے کچھ اور مطالبہ کروں گا؟"

"کس چیز کا مطالبہ؟"

"بیٹی کے بدلے بیٹی۔" ان کا لہجہ سفاک تھا۔

"لالہ! آپ کو کیا ہو گیا ہے؟" تبریز جیسے ہل کر رہ گئے۔

"میں پاگل ہو رہا ہوں تبریز! اور یاد رکھنا جو میرے راستے میں آیا، بچ نہیں سکے گا۔" وہ جیسے حواسوں میں ہی نہ تھے۔

"جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے اس کی بیٹی بہت کم عمر ہے بلکہ شاید...... تیرا چودہ سال کی ہے۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے؟"

"فرق پڑتا ہے لالہ! زرشام آپ کو بالکل نہیں کرنے دے گا یہ۔" انہوں نے جیسے انہیں زرشام کی باغی اور ضدی فطرت یاد دلائی۔

"اسے ماننا پڑے گا تبریز! اگر وہ میرا بیٹا ہے تو اسے صرف یہی کرنا ہو گا جو میں کہوں گا۔"

"مگر لالہ! اگر اس نے اعتراض کیا تو؟"

"نہیں، میں اسے اعتراض کا موقع ہی نہیں دوں گا۔"

"پھر بھی......"

"میں نے کہا نا تبریز! میں انتقام میں پاگل ہو چکا ہوں، میرے خون میں انتقام کی آگ ہے اور یہ پیاس اب تبھی بجھے گی جب میں سلطان چوہدری کی بیٹی کو اپنے گھر لاؤں گا اور عبرت کی مثال بنا دوں گا۔" وہ خون آشام لہجے میں بول رہے تھے اسی دوران انہیں فون آ گیا کہ پنچائیت بیٹھ چکی تھی، سلطان چوہدری بھی آ چکا تھا، انہوں نے تبریز کو ساتھ لیا اور خود بھی روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

"لال حویلی" میں کہرام سا مچ گیا تھا، سلطان چوہدری کو بالکل امید تھی نہ توقع کہ زو

ملک اس معاملے کو پنچائیت تک لے جائیں گے، وہ ٹپٹا سے گئے تھے، مگر پھر اپنے طاقتور اور با رسوخ ہونے کا احساس ہوتے ہی انہوں نے نخوت و کروفر سے سر جھٹکا اور تائب کو ساتھ لے کر روانہ ہو گئے۔

کاروائی شروع ہو چکی تھی، دونوں پارٹیوں کے ساتھ ساتھ مسلح گارڈز بھی تھے تاکہ اگر متعلقہ فریق کسی غلط ارادے سے بھی آیا ہو تو ناگوار صورتحال سے بچا جا سکے۔

تائب چوہدری پہ الزام تھا کہ اس نے معصوم و کمسن گل رعنا کو ورغلایا تھا اور اسے مجبور کیا کہ وہ اس کے ساتھ فرار ہو جائے، اس کے اس قدم نے "ملک خاندان" کی عزت و شان کا بت دھڑام سے نیچے گرا کر تڑخا دیا تھا، زوریز ملک نے اس قدر واویلا مچایا تھا اور اتنا تماشا لگایا کہ پنچائیت ان سے یہ پوچھنے پہ مجبور ہو گئی کہ وہ کیا چاہتے ہیں؟ جس کے جواب میں ان کا ایک ہی مطالبہ تھا کہ ان کی توہین ہوئی ہے اس لئے ان کی عزت بحال کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ بھی سلطان چوہدری کی بیٹی کا نکاح اپنے بیٹے سے کر دیں اب خدا معلوم یہ وٹہ سٹہ تھا، یا ونی کی منحوس کالی رسم۔

سلطان چوہدری صحیح معنوں میں چکرا کر رہ گئے تھے، اس بات کا تو انہوں نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ معاملات یہ رخ اختیار کر جائیں گے۔

"ہرگز نہیں، میری بیٹی بہت چھوٹی ہے۔" وہ تڑپ کر کھڑے ہوئے۔

"ذرا سانس لیجئے چوہدری صاحب! آج آپ پنچائیت کے رکن کی حیثیت سے نہیں بلکہ مدعی کی حیثیت سے آئے ہیں۔" ایک اعلیٰ عہدے دار نے انہیں ٹوکا۔

وہ ہونٹ چباتے ہوئے بیٹھ گئے، تائب بھی اب مضطرب نظر آ رہا تھا۔

"ایسے بہت سے معاملات اسی طریقے سے حل کئے گئے ہیں، مجھے آپ سے انصاف چاہیے سائیں! ایسا نہ ہو کہ آپ کا یک طرفہ فیصلہ گاؤں کے مکینوں کو یہ سوچنے پہ مجبور کر دے کہ یہاں طرف طاقتور کا ساتھ دیا جاتا ہے۔" زوریز ملک کا لہجہ زہریلا ہو گیا تھا۔

سلطان چوہدری نے پھر کچھ بولنا چاہا مگر سرپنچ نے ہاتھ اٹھا کر انہیں روک دیا اور پھر سرگوشیوں میں بحث و تمحیص ہونے لگی۔

اور پھر کچھ دیر بعد وہ فیصلہ سنا دیا گیا جس کی خواہش زوریز ملک نے کی تھی ایک اعلیٰ عہدے دار نے کیا گیا فیصلہ بلند آواز میں سنایا تھا۔

"اس پنچائیت نے دونوں فریقین کا بیان لینے کے بعد یہ فیصلہ کیا ہے کہ زوریز ملک مظلوم ہیں ان کی عزت نیلام ہوئی اور سارے گاؤں میں ان کا تماشا بن گیا، اس لئے ایسے معزز و معتبر شخص کی عزت بحال کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سلطان چوہدری کی بیٹی ونی کر دی جائے اور اس کا نکاح زرشام ملک سے کر دیا جائے، یہ پنچائیت کا حکم ہے اور اس میں ذرا سی بھی تاخیر برداشت نہیں کی جائے گی، ہمارا کام مظلوموں کی دادرسی کرنا ہے اگر کسی کو اعتراض ہے تو وہ ابھی بول سکتا ہے۔" زوریز ملک کے چہرے پہ جیت کی خوشی تھی انہوں نے سلطان چوہدری کو دیکھا تو ان کی آنکھیں پکار رہی تھیں کہ۔

"تم نے دیکھا چوہدری! اسے کہتے ہیں انتقام۔" پھر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

"میں اپنے بیٹے کی بارات لے کر کب آؤں چوہدری؟" ان کا لہجہ سرد اور چبھتا ہوا تھا۔

"اس کی ضرورت نہیں، نکاح یہیں ہو گا، تائب! جاؤ زیمل کو لے آؤ۔" سلطان چوہدری کا

طنطنہ قدرے دھیما پڑ گیا تھا۔

تائب تاریک چہرے کے ساتھ باہر نکل گیا، وہ طوفانی انداز میں گاڑی چلاتا ہوا ”لال حویلی“ میں داخل ہوا تھا، حویلی میں تاحال جشن جاری تھا، وہ تیز تیز قدم اٹھاتا اندر کی طرف بڑھ گیا۔

پتا نہیں آج کا دن اپنے جلو میں کیا کیا لئے ہوئے تھا؟

گل رعنا ہال کمرے میں سب لڑکیوں و عورتوں و بچوں میں گھری بیٹھی تھی اور اس کے بالکل ساتھ زیمل بیٹھی تھی، تائب کو لگا اس کا دل پھٹ گیا ہو، وہ تیزی سے گل کی طرف آیا اور قدرے جھک کر بولا۔

”اندر آؤ مجھے تم سے بات کرنا ہے۔“ سب لوگ حیران رہ گئے، ہجوم سے حیرانی تما آوازیں اٹھیں مگر وہ کسی کی طرف دیکھے بنا اس کا ہاتھ تھام کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا، گل حیران سی رہ گئی، کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے دروازہ بند کر دیا۔

”کیا بات ہے تائب؟“

”میری بات کا مختصر سا جواب دینا گل، زرشام ملک کیسا آدمی ہے؟“

”بہت اچھے۔“

”لاہور میں کیا کرتا ہے؟“

”ماسٹرز کے بعد ایم فل کر رہے ہیں۔“

”مزاجاً کیسا ہے؟“

”کم گو اور بہت نرم مزاج۔“

”یہ خون بہا، ونی، کاروکاری اور وٹہ سٹہ وغیرہ کی رسموں کے بارے میں کیا خیالات ہیں اس کے؟“

”بہت سخت خلاف ہیں، جب بھی گاؤں میں کوئی ایسا مسئلہ ہوتا ہے تو وہ بابا سے بہت جھگڑتے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ اسی وجہ سے وہ زیادہ گاؤں آنا پسند نہیں کرتے۔“

”کہیں انگیج منٹ وغیرہ؟“

”نہیں۔“

”انوالومنٹ؟“

”جہاں تک مجھے علم ہے، وہ کہیں بھی انوالو نہیں ہیں، وہ ہمیشہ بابا کو یہی کہتے ہیں کہ وہ ان کی پسند سے شادی کریں گی۔“

”اب سنو! تمہارے باپ نے پنچائیت بٹھائی ہے اور......“ وہ آہستہ آہستہ ساری تفصیل بتاتا چلا گیا۔

گل رعنا کا رنگ زرد پڑ گیا تھا وہ بری طرح لرزنے لگی اسے بھی بابا سے قطعاً اس اقدام کی توقع نہیں تھی، تائب نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے اسے بیڈ پہ بٹھا دیا۔

”میں جا رہا ہوں زیمل کو لے کر، جب تک میں واپس نہ آؤں تم کمرے سے باہر مت آنا۔“ اس نے تسلی آمیز انداز میں اس کا ہاتھ تھاما اور اسے تھپتھپا کر باہر نکل گیا۔

دوسری طرف زوریز ملک فون پر زرشام سے جھگڑ رہے تھے وہ اسے قریب قریب ہر طرح سے دھمکا چکے تھے مگر وہ بھی ہٹ کا پکا تھا مان کر نہ دیا، مجبوراً انہیں ترپ کا آخری پتا استعمال کرنا پڑا تھا، انہوں نے اسے دھمکی دی تھی کہ اگر وہ اس نکاح کے لئے رضامند نہ ہوا تو وہ گل افشاں کو طلاق دے دیں گے اور بڑا ذہین و ضدی سا زرشام اس پوائنٹ پہ آ کے ہار مان گیا تھا۔

اور پھر وہ سب ہو گیا، دن کا سورج ڈھلتے ڈھلتے دو زندگیوں کو تاریک کر گیا تھا، نکاح نامے پہ سائن کرتے ہوئے اسے ہنسی آ رہی تھی۔

کیا تھا وہ؟

ان رسموں کے خلاف تھا، ان سے نفرت کرتا تھا

ہمیشہ باپ سے ان کی وجہ سے جھگڑتا تھا

اور آج!!!

خود انہی کی بھینٹ چڑھ گیا تھا

ان دروازوں کا کیا کروں؟
جن کے پیچھے
رشتوں کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے خواب
اور تعلق داریوں میں الجھا ہوا احساس
اور وفاداریوں میں محصور تمنائیں
چیخنا چاہتی ہیں
اور ان دروازوں کا کیا کروں
جن کے پیچھے دھڑ دھڑاتے ہوئے سینوں میں
وحشتیں چن دی گئی ہیں
آرزؤں کی کھیتیاں بو کے
گھٹن کے سپرد کر دی گئی ہیں

تائب کی کوشش تھی کہ وہ کم از کم ایک بار زرشام سے بات ضرور کرے، اس سے ملے تاکہ اسے تسلی ہو سکے مگر اس کی خواہش پوری نہ ہو سکی، زرشام نکاح کے فوراً بعد واپس ”قصر گل“ روانہ ہو گیا تھا۔

اس بات کا تائب کو دلی افسوس ہوا تھا، وہ بہر حال خود کو ہی قصوروار گردان رہا تھا، اس نے گل رعنا کو غلط راستے سے اپنانے کی بجائے، سیدھی طرح اپنے والدین کے سامنے اپنا معاملہ رکھ دیا ہوتا اور یا پھر انہیں مجبور کیا ہوتا کہ وہ اس کا رشتہ لے کر ”قصر گل“ جائیں تو حالات یقیناً مختلف ہوتے مگر افسوس، اس کے اٹھائے ایک غلط قدم نے چار لوگوں کی زندگیوں کا رخ بدل دیا تھا، پتا نہیں اب کیا ہونے والا تھا؟

☆☆☆

”زرشام ملک“ جب سے آیا تھا، مسلسل کمرہ بند تھا، وہ تو قسمت کے اس مذاق پہ بس حیران سا تھا کہ آخر یہ اس کے ساتھ ہو کیا گیا تھا؟

اب پتا نہیں وہ لڑکی کیسی تھی جو خوامخواہ اس بھیانک رسم کی بھینٹ چڑھ گئی، بہت دیر تک وہ جاگتا رہا اور سوچتا رہا پھر اس نے اپنا بیگ کھولا اور پیکنگ کرنے لگا، سامان تھا ہی کتنا، دو منٹ میں سمٹ گیا، اسی اثناء میں دروازے پہ دستک ہوئی۔

”یس۔“ اس نے کہا۔

دروازہ بڑے ڈرے سہمے اور جھجکے ہوئے انداز میں کھولا گیا تھا، زرشام کی نظر آنے والے پہ جم گئی۔

یہ چہرہ اس کے لئے بالکل نیا تھا، وہ قریباً چودہ پندرہ سال کی ایک معصوم و نوخیز لڑکی تھی جس نے بدرنگ کپڑے پہن رکھے تھے، جس کی پھٹی اوڑھنی سے اس کے سنہرے بال جھانک رہے تھے اس کا چہرہ سرخ تھا اور آنکھیں سوجی ہوئی تھیں، اس کے ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھی۔

”کون ہو تم؟“ وہ خاصا چونک کر بولا تھا، جس کے جواب میں اس نے اپنی ہراساں آنکھیں اٹھا کر بے حد شکایتی نظروں سے اسے دیکھا تھا، وہ حیران سا رہ گیا، لڑکی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری ہوئی تھیں اور آنکھیں کیا تھیں؟ میرے خدا! جیسے دو ننھے ننھے چمکتے سنہرے کانچ، اس نے سسکی سی لی تھی۔

”میں...... آپ کی...... ملازمہ۔“ وہ بدستور ٹرے ہاتھوں میں اٹھائے ہوئے تھی، اس نے جیسے رٹے رٹائے الفاظ بولے۔

”اوہ......اچھا......تو تم رو کیوں رہی ہو؟“

”انہوں نے مارا ہے۔“ وہ اب آنسوؤں کے ساتھ رو رہی تھی، ٹرے اس کے ہاتھ میں لرز رہا تھا، زرشام نے ٹرے اس کے ہاتھوں سے لے لیا اور اسی اثناء میں اس کی نظر اس کی دائیں کلائی پہ پڑی جس میں موٹا سا سلور کا کڑا تھا، جو

اس بات کی دلیل تھا کہ وہ کسی نیچ ذات سے تعلق رکھتی تھی (وہاں یہ کڑا اس بات کی نشانی تھی)۔

''کس نے مارا ہے؟'' زرشام نے گلاس میں پانی ڈالتے ہوئے پوچھا، اسے فی الوقت اپنے سوا کسی سے بھی ہمدردی نہیں ہو رہی تھی۔

''بڑے ملک جی نے۔'' وہ بدستور رو رہی تھی۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' اس نے پہلا گھونٹ لے کر پوچھا۔

''ز......زیمل۔'' وہ ہکلا سی گئی تھی۔

زرشام پہ جیسے کمرے کی چھت آ پڑی، گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا گرا اور پانی کارپٹ پہ بہہ گیا۔

''تم زیمل ہو؟'' وہ بے یقینی سے پوچھ رہا تھا۔

جواباً وہ اسی طرح روتی رہی اور اس نے سارا ماجرہ کہہ سنایا، جب اسے تبریز چچا اپنی گاڑی میں ڈال کر لے کر آئے تھے تو ''قصر گل'' میں پہنچتے ہی زوریز ملک نے اسے بے اختیار پیٹنا شروع کر دیا اگر فیملی کے دوسرے لوگ درمیان میں نہ آتے تو شاید وہ اسے مار ہی ڈالتے، پھر اسے ملازماؤں کے سپرد کر دیا گیا اور ان سے کہا گیا کہ وہ اسے بھی ملازماؤں والا درجہ دیں، اسے گھٹیا اور گھسے ہوئے کپڑے پہننے کو کہا گیا اور ستم بالائے ستم کہ اسے وہ سلور کا کڑا پہنا دیا گیا تا کہ وہ بھی مکمل طور پر ملازماؤں و نوکرانیوں کے قبیلے کی لگے، زرشام کو لگ رہا تھا کہ وہ پاگل ہو جائے گا، اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ زیمل اتنی سی لڑکی ہو گی یا شاید بچی کہنا مناسب ہوتا، ظلم کی انتہا تھی، کھولتے دماغ اور جلتی آنکھوں سے وہ کسی بگولے کی طرح چکراتا ہوا باہر نکل گیا۔

اور پھر قصر گل کی در و دیوار نے دیکھا کہ وہ زرشام ملک جو کبھی باپ کے سامنے بلند آواز سے بولتا نہ تھا، ''قصر گل'' اس کی چنگھاڑوں سے گونج رہا تھا، اس نے زوریز ملک سے اتنا جھگڑا کیا کہ حد نہیں، اس نے ان سے کہا کہ وہ سب کچھ جانتے تھے اور جانتے بوجھتے ہوئے انہوں نے زرشام کو قربانی کا بکرا بنا لیا صرف اپنی انتقام کی آگ بجھانے کے لئے وہ اس حد تک گر گئے کہ ایک بچی کے ساتھ اس کا نکاح کروا دیا، اس نے ان پر الزامات کی بوچھاڑ کر دی۔

وہ بلند آواز میں دھاڑ رہا تھا اور پورا مردان خانہ گونج رہا تھا، اس نے صاف طور پر الزام لگایا کہ انہوں نے یہ سب جانتے بوجھتے کیا ہے، مستزاد جو سلوک زیمل کو یہاں لانے کے بعد کیا گیا تھا ذلالت کی انتہا تھی، مگر زوریز ملک کو جیسے بیٹی کھونے کے بعد کوئی پرواہ ہی نہ تھی بیٹے کی، ان کا ایک ہی جواب تھا۔

''وہ دشمن کی بیٹی ہے۔''

زرشام جانتا تھا کہ وہ کس قدر کٹر سوچوں کے مالک لوگ تھے، پرانے عقیدے، خیالات و دشمنیاں ان کے لئے زندگی و موت کا مسئلہ تھیں مگر اس نے کبھی اپنے باپ کو ایسا نہ سمجھا تھا، وہ اس وقت اس کے چیخنے چلانے کا کوئی نوٹس ہی نہ لے رہے تھے، آخر تھک کر وہ بولا تھا۔

''آپ کو کیا لگتا ہے بابا! میں اسے اس طرح اس حالت میں، آپ کے رحم و کرم پہ چھوڑ دوں گا؟ ناممکن...... میں اسے ساتھ لے کر جاؤں گا۔'' شدت جذبات سے اس کا رنگ دہک رہا تھا اور آنکھوں سے گویا خون ٹپک رہا تھا، لہجے میں سرکشی تھی۔

''تم اسے کہیں نہیں لے جا سکتے۔'' وہ حکمیہ لہجے میں بولے تھے۔

''آپ بھول رہے ہیں ابھی دو گھنٹے پہلے

آپ نے ہی اس کا نکاح میرے ساتھ کروایا ہے، اس لحاظ سے وہ میری بیوی ہے اس لئے میں اسے جہاں چاہوں لے جا سکتا ہوں۔'' وہ غرا کے بولا تھا۔

''تو پھر میری بات یاد رکھنا، اگر تم اسے اپنے ساتھ لے کر گئے تو دوبارہ اس دہلیز پہ، میرے گھر کے دروازے پہ مت آنا، سمجھ لینا باپ مر گیا تمہارا۔'' وہ جیسے خون آشام لہجے میں بول رہے تھے۔

زرشام کے پیروں کے نیچے سے زمین سرک گئی وہ کھڑے قد سے لڑکھڑا سا گیا۔

''ٹھیک ہے بابا جان! جیسے آپ کا فیصلہ۔'' اس کی آنکھوں میں ریت سی چبھ رہی تھی وہ آندھی و طوفان کی مانند باہر نکل گیا۔

رات کی تاریکی نے ایک عجب منظر دیکھا ''قصر گل'' کے اکلوتے وارث نے ایک لفظ کہے بنا، زیمل کا ہاتھ تھاما اور گیٹ پار کر گیا، گل افشاں ملک لہرا کے زمین پہ آ گری تھیں۔

دھند جیسے ماتمی فضا کو آغوش میں لئے کسی ماں کی طرح تھپک رہی تھی، درخت ہولے ہولے لرز رہے تھے اور سنسان خاموش کھڑے کھیتوں میں جیسے آنسوؤں کے ڈھیر تھے جو ڈھیرے ڈھیرے کھالیوں میں سے رستہ بناتے بہتے جاتے تھے۔

ذرا تم صبح ہونے دو
کہ سورج کو تو آنے دو
پرندوں کو تو اڑنے دو
ذرا تو صبح ہونے دو
ابھی تو آسمان کا رنگ نکھرے گا
ابھی خوشبو بھی بکھرے گی
ابھی موسم بھی بدلے گا
ابھی تو چاند ڈوبے گا
ابھی منظر بدلنے میں
ذرا سی دیر باقی ہے
ابھی دل کے سنبھلنے میں
ذرا سی دیر باقی ہے

☆☆☆

کمرے میں ایک دھند بھری کہر آلود خاموشی تھی، حالانکہ دو نفوس موجود تھے مگر وہ دونوں ہی اس وقت بات کرنے کی پوزیشن میں نہ تھے، ''گل رعنا'' اس وقت بھی دلہن کے لباس میں تھی اور بیڈ پر نڈھال سی بیٹھی تھی، پریشانی اور خوف نے اس کا برا حال کر رکھا تھا، پتا نہیں آنے والا وقت کیسا تھا؟ اسے تو فی الوقت ہر چیز دھند میں لپٹی نظر آ رہی تھی حتیٰ کہ وہ تمام خواب بھی جو اس نے تائب کے حوالے سے دیکھے تھے اور جن کو پورا کرنے کے لئے وہ ہر رکاوٹ پار کر کے یہاں تک چلی آئی تھی۔

دوسری طرف وہ بار بار لب کچل رہا تھا، کمرے میں ادھر سے ادھر چکر لگاتے وہ کسی بندھے ہوئے شیر کی طرح نظر آتا تھا، اس کی نظریں فون پہ مرتکز تھیں غالباً اسے کسی خاص فون کال کا انتظار تھا اور پھر کچھ دیر بعد فون جاگ اٹھا، اس نے پہلی بیل پہ ہی فون اٹھا لیا، وہ صرف ہوں ہاں کرتا رہا، دوسری طرف سے بات سنتے ہوئے اس کا رنگ پہلے سرخ ہوا اور اب بتدریج زرد ہو رہا تھا پھر گل نے اسے لڑکھڑا کر بیڈ پہ بیٹھتے دیکھا یقیناً اس میں کھڑا ہونے کی ہمت ہی نہ رہی تھی، وہ اب لب بھینچے دوسری طرف سے بات سن رہا تھا اور پھر اس نے فون بند کر دیا، گل نے دیکھا اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔

''کیا ہوا تائب! کس کا فون تھا؟'' اس نے پوچھا، وہ یوں چونک کر متوجہ ہوا جیسے پہلی بار اس کی موجودگی سے آگاہ ہوا ہو۔

''انہوں نے بہت مارا ہے زیمل کا۔'' وہ دانت بھینچتے ہوئے خود پہ قابو پا رہا تھا ورنہ شاید رو دیتا۔

''کس نے؟'' اس پہ جیسے آسمان ٹوٹا۔

''زوریز ملک نے اور اس کے بعد انہوں نے اس کے ہاتھ میں وہ چاندی کا کڑا پہنا دیا زبردستی اور اسے یہ حکم دیا گیا ہے کہ وہ اب ''قصر گل'' کی ملازمہ ہے انہوں نے اسے ملازماؤں جیسے کپڑے پہننے پر مجبور کیا اور اس کے بعد وہ جو لباس ادھر سے پہن کے گئی تھی اسے آگ دکھا دی، گل! میں کیا کروں؟ میری بہن!'' وہ جیسے ہار سا گیا تھا، آنکھوں میں اذیت کی سرخی پھیلی ہوئی تھی۔

گل تو سنتے ہی رونے لگ گئی، بھلا اسے کب توقع تھی ان کے اتنے شدید رویے کی؟ مگر سچ ہے انتقام اور غصے میں پاگل انسان، انسانیت کی سطح سے بہت نیچے آ جاتا ہے، جیسے وہ آ گئے تھے، گل اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ اسے یہ سب کیسے معلوم ہوا مگر اس سوال کا نہ موقع تھا اور نہ مطلب، یقیناً اس کے ذرائع ہوں گے، تائب اب دروازے کی سمت جا رہا تھا شاید سلطان چوہدری کو یہ سب بتانے، یہ خیال آتے ہی وہ لپک کر اس کی طرف بڑھی اور اس کی راہ میں حائل ہو گئی۔

''نہیں تائب! خدا کے لئے کسی کو کچھ مت بتانا، اس سے اور کچھ ہو نہ ہو، نفرت ضرور پڑے گی، اپنی اماں کا سوچو تائب! وہ کس قدر پریشان ہے اور ایسے میں اگر تم مزید انہیں پریشان کن خبریں سناؤ گے تو کیا ہو گا سوائے مزید خرابی کے؟'' وہ التجائیہ انداز میں بولتی گئی۔

''تو کیا کروں؟ خاموش ہو کے بیٹھ جاؤں؟'' وہ جیسے بے بس سا ہو گیا تھا۔

''نہیں مگر ہم انتظار تو کر سکتے ہیں نا! اچھے وقت کا۔'' اسے خود بھی اپنے کمزور پوائنٹ کا احساس تھا۔

''ایسا کچھ نہیں ہو گا۔'' تائب نے سر جھٹکا۔

''مگر پھر بھی...... اس طرح سب کو بتا کر کیا حاصل ہو گا؟''

''مجھے تو یہ سمجھ نہیں آ رہی کہ آخر زرشام ملک نے کچھ......'' اس کی بات ادھوری رہ گئی، اس کے فون کی بیل بج اٹھی، اس نے چونک کر فون پہ نظر دوڑائی اور پھر فوراً کال پک کر لی۔

''ہاں بولو۔''

''کیا؟'' وہ بلند آواز سے بولا۔

''پھر کیا ہوا؟'' اس کی آواز میں بے تابی تھی۔

گل نے دیکھا اس کے چہرے کی رنگت بتدریج لوٹنے لگی تھی لازماً کوئی حوصلہ افزا خبر تھی مگر کیا؟ وہ جلد از جلد جاننا چاہتی تھی، دس پندرہ منٹ فون سننے کے بعد اس نے کال بند کی اور گل رعنا کی طرف مڑا تو اس کا رنگ جوش سے سرخ پڑ رہا تھا۔

''گل! میں ...... بہت...... بہت خوش ہوں۔'' اس نے خوشی سے کہتے ہوئے گل کو دونوں بازوؤں میں تھام کر گھما ڈالا۔

''کک...... کیا ہوا تائب؟ کوئی اچھی خبر ہے کیا؟''

''اچھی؟ بہت بہت اچھی خبر ہے، تمہیں پتا ہے ''قصر گل'' میں کیا ہوا ہے، زوریز ملک اور زرشام میں بہت سخت تلخ کلامی ہوئی ہے اس نے اپنے باپ پر بے تحاشا الزامات لگائے ہیں اور انہیں بتایا ہے کہ وہ یہ سب زیمل کے ساتھ قطعاً برداشت نہیں کرے گا، اصل میں تو اسے پتا ہی نہیں تھا کہ وہ اس کے نکاح کے لئے مصر کیوں

ہیں، اگر وہ انتقام ہی لینا چاہتے ہیں تو جائیں اور تائب اور گل رعنا کو گولیاں مار دیں مگر کم از کم یوں ایک معصوم بچی پر تشدد کر کے اپنا وقار و عزت تو مت گنوائیں، بس مختصراً یہ کہ ان کے بیچ سخت جھگڑا ہوا جس کے بعد وہ زیمل کو ساتھ لے گیا ہے شاید لاہور، تمہارا بھائی واقعی بہت اچھا ہے، اس نے ایک سچا مرد ہونے کا ثبوت دیا ہے گل رعنا۔'' اس نے گل کے دونوں ہاتھ تھامے ہوئے تھے اور بولتا جا رہا تھا۔

اور وہ تو وہاں تھی ہی کب؟ اس کا دل سجدہ شکر میں جھکا ہوا تھا اور آنکھیں نم اس کے لالہ نے اس کی عزت رکھ لی تھی ورنہ تھوڑی دیر پہلے اسے یہی لگ رہا تھا کہ زندگی اب یوں ہو گی کہ۔

محبت اندھیری رات بن کر آ جائے گی اک دن
یوں اپنے سب رشتوں سے تیری بغاوت اچھی نہیں

مگر اب تائب کی خوشی دیکھ کر تشکر کے احساس سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، وہ بے ساختہ ہنس پڑی، اسے ہنستا دیکھ کر تائب پہلے تو حیران ہوا پھر خود بھی ہنس دیا۔

☆☆☆

پھٹی ہوئی آنکھیں
فالج زدہ زبان
اور مفلوج بازوؤں کا یہ سفر
جو نہ جانے کتنی صدیوں سے مجھے طے کر رہا ہے
آخر یہ میری انتہا تک پہنچ کیوں نہیں جاتا؟
اور یہ آنسو! یہ سارے کے سارے آنسو!!
ایک ہی بار ایک ہی ساتھ بہہ کیوں نہیں جاتے؟

وہ لب بھینچے ڈرائیو کر رہا تھا اور اس کے بالکل ساتھ والی سیٹ پر بیٹھی زیمل کسی مجسمے کی مانند ساکن تھی، ایک ہی دن میں اس کے ساتھ اتنا کچھ ہو گیا تھا کہ اس کا ناپختہ شعور قبول کرنے میں ہچکچا رہا تھا۔

اس کے زخم زخم وجود سے جیسے ٹیس اٹھ رہی تھیں مگر خوف و وحشت کی وجہ سے اس قدر سہمی ہوئی تھی کہ سانس بھی آہستہ لے رہی تھی، اب تک کا سفر نہایت خاموشی سے کٹا تھا وہ بری طرح ڈرائیونگ میں غرق تھا اس نے ایک بار بھی نگاہ اٹھا کر اپنے ساتھ بیٹھے ذی نفس کہ نہ دیکھا تھا۔

بلکہ شاید وہ خود اس قدر الجھا ہوا تھا کہ اس کی ذات سے یکسر بے گانہ ہو گیا تھا، پھر اس نے گاڑی کی اسپیڈ سلو کرنا شروع کر دی، وجہ غالباً یہی تھی کہ اب دیہی علاقہ ختم ہو رہا تھا اور ایک طرف بڑا سا نیلا بورڈ لگا ہوا تھا۔

''رفتار آہستہ آگے آبادی ہے۔''

اب شہر کی روشنیاں شروع ہو رہی تھی، حالانکہ وہ آج تک شہر نہ آئی تھی اور اسے بے حد شوق تھا کہ وہ شہر دیکھے مگر اس وقت سچوئیشن اس طرح کی تھی اس نے سر اٹھا کہ بھی نہ دیکھا کہ اس کے ارد گرد کیا ہو رہا تھا۔

پھر اس نے ایک بڑے سے شاپنگ مال کے آگے گاڑی روک دی، گاڑی پارکنگ میں کھڑی کر کے وہ اس کی طرف مڑا۔

''میں پندرہ منٹ تک واپس آ جاؤں گا، کچھ کام ہے، تم پریشان مت ہونا، گاڑی کے شیشے بلیک ہیں باہر سے اندر کا منظر دیکھا نہیں جا سکتا۔'' وہ کہتے ہوئے باہر نکل گیا اور گاڑی لاک کر گیا، وہ خوف کے عالم میں گھٹنے پیٹ میں دبائے زیر لب کچھ پڑھنے لگی، کچھ دیر بعد وہ واپس آ گیا، اس کے ہاتھ میں چند شاپر تھے، اس نے انہیں پچھلی سیٹ پہ پھینکا اور دروازہ بند کر کے اس کے برابر آ کے بیٹھ گیا۔

گاڑی سٹارٹ کرتے ہوئے اس کی نظر زیمل پہ پڑی تو وہ چونک گیا۔

''ایسے کیوں بیٹھی ہو؟'' اس نے پوچھا۔

زیمل اسی طرح بیٹھی رہی، سر گھٹنوں پہ دھرے، پاؤں سیٹ کے اوپر دھرے ہوئے، اس کے اندر کچھ کلک ہوا تھا، اس نے بے ساختہ زیمل کا کندھا ہلایا اور وہ یکدم ڈھلک کر اس کی سمت آ گری، زرشام دھک سے رہ گیا، وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

''اوہ میرے خدا...... مجھے ایک اکیلا چھوڑ کر نہیں جانا چاہیے تھا۔'' اس نے تاسف سے سوچا، گھر یہاں سے زیادہ فاصلے پہ نہ تھا، زرشام نے گاڑی فل اسپیڈ پہ چھوڑ دی اور چند منٹ بعد ہی وہ ''ملک ہاؤس'' کے گیٹ پہ تھا، گاڑی اندر لے جا کے اس نے پورچ میں روکی اور تیزی سے اسے بازوؤں میں سمیٹے باہر آ گیا۔

''نوراں! میری گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ چند شاپر ہیں وہ لے کر آؤ۔'' اس نے ملازمہ کو حکم دیا اور خود تیزی سے اپنے بیڈروم کی طرف بڑھ گیا۔

اس کوٹھی میں دو میاں بیوی ملازم تھے جو گاؤں سے ہی آئے تھے، نوراں اور سعید نامی یہ جوڑا بے اولاد تھا، اس وقت نوراں تیزی سے اس کے حکم کی تعمیل کو دوڑ گئی، اس کی آنکھوں میں واضح تشویش تھی، پتا نہیں یہ لڑکی کون تھی؟ زرشام نے اسے بیڈ پہ لٹایا اور ہوش میں لانے کی تدابیر کرنے لگا، تھوڑی دیر بعد اسے ہوش آ گیا، تب تک نوراں وہ شاپنگ بیگز اس کے کمرے میں رکھ کر جا چکی تھی، اس کی آنکھیں کھلیں تو چند لمحے چھت پہ ساکت رہیں پھر آہستہ آہستہ پتلیاں اپنی آنکھوں میں حرکت کرنے لگیں۔

زرشام خاموش بیٹھا اسے دیکھ رہا تھا، جیسے ہی اس نے زرشام کو دیکھا وہ فوراً اٹھ کر بیٹھ گئی، اس کی رنگت زرد پڑ گئی اور آنکھوں میں خوف سمٹ آیا، وہ یک ٹک اسے دیکھے جا رہی تھی۔

''اٹھو، کپڑے چینج کر لو۔'' اس نے ایک پیکٹ اس کے قریب رکھا اور خود اٹھ کھڑا ہوا، لہجہ بڑا عام سا تھا۔

''میں کھانا لگواتا ہوں، تب تک تم بھی منہ ہاتھ دھو لو۔'' وہ مڑنے لگا تھا جب اس کی آواز نے بڑھتے قدم روک دیئے۔

''پھر آپ بھی مجھے ماریں گے؟'' ڈری سہمی، لرزیدہ آواز، کسی چابک کی طرح اسے لگی تھی وہ بے ساختہ واپس مڑا اور اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔

''نہیں، میں تمہیں کچھ نہیں کہوں، چلو اب اٹھو۔'' اس نے کہتے ہوئے زیمل کا ہاتھ کھینچ کر اسے اٹھایا تھا، وہ خاموشی سے اٹھی اور اس کی ہدایات پہ عمل کرتی گئی، جب تک کھانا آیا تب تک وہ منہ ہاتھ دھو کر دوپٹہ اچھی طرح سر پہ لپیٹ کر صوفہ پہ بیٹھی ہوئی تھی، وہ اس کی کیفیت بہت اچھی طرح سمجھ رہا تھا مگر فی الحال خاموش تھا، جس قسم کا Drastic change اس کی زندگی میں آیا تھا اس کو قبول کرنا بہت مشکل و کٹھن تھا۔

☆☆☆

''قصر گل'' پہ جیسے موت کی سی بربادی و تباہی چھا گئی تھی، یک بیک یہ گھر اپنے وارثوں کی چہچہاٹوں اور کھلکھلاہٹوں سے محروم ہو گیا تھا، یوں جیسے کوئی تیز آندھی چلی اور پل ہی پل میں سب خاک میں ملا کر غائب ہو گئی، گل افشاں بے حد بیمار تھیں، ان سے بیٹے کی جدائی اور بیٹی کی ذلت برداشت ہی نہ ہو رہی تھیں، وہ ہائی بی پی کی مریضہ بن چکی تھیں، گھر سے اور زوریز ملک سے بالکل لاتعلق، یوں ہو گئیں جیسے ان کے ہونے نہ ہونے سے کچھ فرق ہی نہ پڑتا ہو، آج کئی دنوں بعد زوریز ملک ان کے پاس آئے تھے۔

''کیوں خود کو ہلکان کرتی ہو؟ کہیں نہیں جا سکتا وہ؟ آ جائے گا؟'' ان کے دھیمے لہجے میں اپنے کیے کی کوئی شرمندگی نہ تھی، گل افشاں کو جیسے آگ لگ گئی۔

''کبھی واپس نہیں آئے گا وہ، بھول کیوں رہے ہیں؟ آپ ہی کا خون ہے وہ، آپ کی طرح ضدی اور ہٹ دھرم، وہ نہیں آئے گا۔'' وہ بلند آواز میں کہتی کہتی آخر میں رونے لگ گئیں۔

''آپ کو ذرا بھی احساس نہیں ہے کہ آپ نے محض اپنا شملہ اونچا رکھنے کے لئے جو قدم اٹھایا ہے اس نے ہمیں اپنے اکلوتے بیٹے سے محروم کر دیا ہے، کیوں ہیں آپ اونچی ذاتوں والے، انا پرست لوگ، جو زمین پہ چلتے لوگوں کو حقیر کیڑوں سے بھی بدتر سمجھتے ہیں۔'' وہ ہذیانی انداز میں بول رہی تھیں، زوریز ملک انہیں کوئی بڑے سخت الفاظ کہنا چاہتے تھے مگر پھر ان کی بیماری کا خیال کر کے مجبور ہو گئے، وہ دوپٹہ منہ پہ رکھے رو رہی تھیں، وہ اٹھے اور اسی اکڑ و شان سے چلتے کمرے سے باہر نکل گئے۔

شہر میں بستے حیوانوں سے ڈر لگتا ہے
مجھ کو ایسے انسانوں سے ڈر لگتا ہے
اونچی ذات کا ڈھونگ رچا کر ڈستے ہیں
اونچی ذات کے شیطانوں سے ڈر لگتا ہے

☆☆☆

اور پھر ایک ناسمجھ میں آنے والی زندگی شروع ہو گئی، زرشام نے اس پر اس قدر محنت کی تھی کہ کبھی کبھار وہ تھک جاتا تھا، پہلا پورا ماہ وہ بے حد بیمار رہی تھی، پہلے پہل تو وہ اس سے بھی بہت ڈرتی تھی اسے دیکھتے ہی چھپنے کو جگہ ڈھونڈنے لگتی، وہ اس سے بے حد نرمی سے پیش آتا اور اپنے بہتر رویے کی بنا پر جلد ہی اس نے اپنے اور زیمل کے درمیان ایک بہتر Mutual understanding ڈیولپ کر لی تھی۔

زرشام کے بالکل ساتھ والا کمرہ اس کا تھا مگر وہ اکثر راتوں کو ڈر جاتی اور پھر باقی کی پوری رات روتے اور جاگتے گزار دیتی، وہ صبح اس کی متورم و سرخ آنکھیں دیکھ کر حیران ہوتا، مگر ایک دن اسے پتا چل گیا، وہ اسٹڈی میں اپنے تھیسیس پہ کام کر رہا تھا، رات دیر تک کام کرنے کے بعد جب وہ بیڈروم کی طرف بڑھا تو زیمل کے کمرے سے اٹھتی سسکیوں کی مدھم سی آواز کو اس کی قوت سماعت نے بڑی تیز سے کیچ کیا تھا، وہ فوراً دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا اور اسے یوں بیڈ پہ لحاف میں سکڑے سمٹے روتا دیکھ کر حیران رہ گیا۔

''کیا بات ہے زیمل؟'' وہ اس کے نزدیک آ گیا، اس کا رونا اب مدھم پڑ چکا تھا۔

''کیا ہوا ہے مجھے بتاؤ۔'' اس نے زیمل کا چہرہ اوپر کیا اور کراہ کر رہ گیا اس نے کس طرح اپنے سنہرے کانچ کے نگینوں کا رو رو کر حشر کیا ہوا تھا۔

''مجھے اکیلے سونے کی عادت نہیں ہے، مجھے ڈر لگتا ہے۔'' وہ بدستور سہمی ہوئی تھی۔

''اپنے گھر میں کس کے پاس سوتی تھیں؟''

''اماں کے ساتھ۔'' وہ پھر سے رونے لگی شاید اب اماں یاد آ رہی تھیں۔

''اوہ...... آؤ اٹھو...... میرے ساتھ چلو۔'' اس نے ہاتھ پکڑ کر اٹھایا اور اسے ساتھ لے گیا۔

اس دن کے بعد دونوں کا بیڈروم ایک ہو گیا، وہ اس کے بیڈ پہ ہی سوتی تھی مگر اتنے کنارے سے لگ کر کے بہت بار اسے یہ خدشہ لاحق ہوا کہ وہ نیچے ہی نہ گر جائے اور پھر ایک دن یہ خدشہ سچ ثابت ہو گیا، اس کا تھیسس حتمی مراحل

میں تھا اس دن بھی وہ دیر تک کام کرتا رہا تھا، تھک ہار کے سوئے اسے ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی جب ایک زوردار دھڑم کی آواز نے اسے جگا دیا، وہ ہڑبڑا کر اٹھا، اِدھر اُدھر نظر دوڑائی پھر اس کا قہقہہ نکل گیا زیمل زمین پر گری پڑی تھی اور سائیڈ ٹیبل کا کونا لگنے سے اس کی پیشانی کی کھال ہلکی سی پھٹ گئی تھی، وہ اسے اٹھانے کے لئے آگے بڑھ گیا، اس کے ماتھے پہ بینڈیج چپکانے تک وہ خاموش رہا پھر اس نے زیمل کو اچھا خاصا ڈانٹا، وہ بے چاری خاموشی سے رونے لگی، جس پہ اسے مزید غصہ آ گیا۔

''اب اس میں رونے کی کیا بات ہے؟ اتنے کنارے سے لگ کر سونے کی کیا وجہ ہے؟ مجھ سے ڈر لگتا ہوگا؟'' تیسرا فقرہ اس نے طنزاً کہا تھا۔

''آپ اس طرح بات نہ کریں۔'' وہ سوں سوں کرتی التجائیہ انداز میں بولی تھی۔

''کیوں؟''

''مجھے ڈر لگتا ہے۔'' اس نے بے مثال توجیح پیش کی تھی۔

زرشام کے حلق سے ایک طویل سانس نکل گیا، اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اسے اپنے سے ایک فٹ کے فاصلے پہ لٹا دیا۔

''اگر تم یہاں سے ہلیں سرکی بھی نا، تو میں تمہیں بہت ماروں گا سمجھی؟'' اس نے سختی سے کہا اور خود بھی لیٹ گیا۔

اس کے بعد بھی اس کے رونے کا سلسلہ تو تھم گیا تھا مگر اب اسے اکثر ڈراؤنے خواب آیا کرتے تھے، راتوں کو ڈر کر اٹھ جایا کرتی، اسے پُراعتماد بنانے کے لئے اس نے خود کو کتنا بدلا تھا، وہ کم گو تھا، مگر اسے بولنے پہ اکسانے کے لئے وہ کتنی کتنی دیر اس کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہتا، وہ اس کا خوف کم کرنا چاہتا تھا، وہ اسے نارمل زندگی کی طرف لانا چاہتا تھا، اس سلسلے میں وہ اس کے دو تین سائیکاٹرسٹس سے بھی سیشن کرواتا رہا تھا، اس پہ دو نفسیاتی طریقہ علاج استعمال کیے گئے تھے۔

1) کونسلنگ
2) تحلیل نفسی

دونوں سے اسے کافی فرق پڑا تھا مگر ان سائیکائٹسٹ کا کہنا تھا کہ زیمل نفسیاتی طور پر بے حد کمزور تھی جس کی وجہ سے اس میں منفی رجحانات و خیالات کو قابو کرنے کا سسٹم (With Drawl) ہو چکا تھا، یہ نفسیاتی اصلاح میں انسان کی اس کیفیت کو کہتے ہیں جس میں وہ مدافعت کھو دیتا ہے اور پس قدمی اختیار کر لیتا ہے، اگرچہ وہ مکمل طور پر ٹھیک ہو گئی تھی مگر اب بھی وہ وقتاً فوقتاً اسے لے کر جاتا رہتا تھا۔

''میاں بیوی'' کا خوبصورت رشتہ ان کے لئے عجیب پیچیدگی سے بھرا بھید تھا، جبھی وہ اس کا دوست بن گیا کہ اس میں زیادہ آسانی تھی، اس نے لاہور کے سب سے بہترین ادارے میں اس کا ایڈمیشن کروایا تھا۔

''اسے زیمل کو ایسا بنانا تھا جس پہ ساری دنیا فخر کرے۔'' وہ اسے خود پڑھاتا، یوں بھی اس کا ایم فل تو ہو چکا تھا اس کے پاس دو تین کالجز کی طرف سے بہت اچھے سیلری پیکج کے ساتھ جاب کی آفرز تھیں، مگر وہ مزید کسی بہتر کے لئے غور کر رہا تھا، جبھی ان آفرز پر سنجیدگی سے غور نہیں کر رہا تھا، زیمل کو اس نے 18th اسٹینڈرڈ میں ایڈمٹ کروایا تھا وہ اسے خود چھوڑ کے آتا اور خود لینے جاتا تھا۔

اسی دوران اس کو ایک یونیورسٹی میں جاب کی آفر آ گئی، انٹرویو اور ٹیسٹ کے بعد

Evalutio میں اسے بالکل پرفیکٹ قرار ے دیا گیا تھا یوں وہ پروفیسر زرشام ملک بن یا، ''قصر گل'' کی طرف سے کسی نے پیش رفت ی تھی، اسے کبھی کبھار حیرت ہوتی، وہ کتنا غیر م تھا ان کے لئے؟ ان کا اکلوتا وارث جس کی زشتہ چھ ماہ سے کسی نے خبر تک نہ لی تھی، مگر وہ ی تو آخر انہی کا بیٹا تھا کیسے ہار مان لیتا، وہ بھی مداً خاموش تھا اور اس کی خاموشی پکارتی تھی۔

☆☆☆

ے کہنا خوش فہمی میں مت رہے
ہ تم سے ہم کلام ہوں گے
م تو خود سے بھی خفا ہوں
صدیوں خاموش رہتے ہیں

زرشام کو ڈسچارج کر دیا گیا تھا، ڈاکٹر دانش نے ہلکی پھلکی غذا کے ساتھ ساتھ معمولی سی بھی نشن لینے سے سختی سے منع کیا تھا، مگر وہ جانتی تھی کہ ہوسپٹل میں تو وہ اس بات پہ عمل کر سکتی تھی وں کہ اس کے سامنے نہ آئے مگر گھر میں یہ ممکن تھا، جبھی اس نے اس قسم کی کوئی کوشش بھی نہ کی ی، ان دونوں کے بیچ ایک سرد خاموشی تھی، اس ساری صورتحال پہ زیمل کا دل روتا تھا، وہ خاموشی سے اس کی تیمارداری کرتی رہتی، اس کے لئے کھانا بنا کے لاتی، اس کے کپڑے واش روم میں لٹکا دیتی، دوپہر میں اس کے سونے کے بعد وہ دیگر کام نمٹاتی رہتی، پھر شام کو اسے جوس یا رُوٹ اس کے بعد وہ لان میں ہلکی سی واک کرتا وہ ڈنر کی تیاری کرتے ہوئے کچن سے اسے دیکھتی رہتی اور اسے خود سے نفرت ہوتی، خود سے گھن آتی، کیا تھی وہ؟ احسان فراموش، نمک حرام پھر اس کی تھالی میں کھا کر اسی میں چھید کرنے والی غلیظ اور گھٹیا لڑکی، اسے خود کو یہ سب باور کرواتے ہوئے ذرا بھی ترس نہ آتا، وہ میڈیکل لیو پر یونیورسٹی کی طرف سے چھٹی پہ تھا، جبکہ زیمل تو یوں بھی فری ہی تھی آج کل۔

محبت کہیں چلی گئی ہے
لگتا ہے میرے اندر ہی اندر
کہیں دور چلی گئی ہے
اور اپنے بہت سارے سائے
پیچھے چھوڑ گئی ہے
میرے آس پاس
اور ارد گرد

وہ کرب سے سوچتی رہتی، وہ تو اس سے نگاہیں بھی نہیں ملاتی تھی کہ خود کو اس قابل ہی نہ سمجھتی تھی، کیا تھا وہ شخص؟ ایک دیوتا، کیا نہیں کیا تھا اس نے زیمل کے لئے؟ وہ تو اس کے احسانوں کے نیچے اس قدر دبی ہوئی تھی کہ سر اٹھانے کے بھی اہل نہ تھی مگر اس نے یہ سب کیا تھا اس نے دیوتا جیسے زرشام کو تڑاخ سے زمین پہ گرا کے پاش پاش کر دیا تھا، اس نے رتبہ بدلنا چاہا تھا، اس نے حیثیت بدلنی چاہی تھی، اس نے Do more کا مطالبہ کر کے اس شخص کے ساتھ کیا کیا تھا؟ وہ جانتی تھی اور اس آگہی کا کرب اس قدر بھاری تھا کہ اس کے کندھے ٹوٹنے لگے تھے۔

آج ایک سرد شام، کمرے کی پرحدت فضا میں وہ ایزی چیئر پہ جھول رہا تھا اور وہ اس کی وارڈروب سیٹ کر رہی تھی، جب نوراں اندر آئی تھی، اس سے ملنے کچھ لوگ آئے تھے، وہ اٹھ کر باہر چلا گیا، زیمل خود بخود کام چھوڑ کر کچن کی طرف بڑھ گئی، اسے چائے کے انتظامات دیکھنا تھا، اپنی نگرانی میں سب کچھ تیار کروا کر وہ نوراں کے ہاتھ ہال میں بھیج کر واپس کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆

یہ ''ملک ہاؤس'' میں صبح کا آغاز تھا، پانچ بجے کا الارم بجا تو ایک ساتھ دونوں کی آنکھ کھل گئی تھی، زیمل نے مندی مندی آنکھوں سے اسے باتھ روم میں جاتے دیکھا تھا، پھر وہ پھرتی سے اٹھی اور چھلانگ مار کر کارپٹ پہ بکھری اپنی کتابیں اور نوٹ بکس سمیٹنے لگی، رات وہ پڑھتے پڑھتے یونہی ہر چیز پھیلائے چھوڑ کر سو گئی تھی، چونکہ زرشام بے حد تھکا ہوا تھا اور اس کے سر میں بھی حد درد تھا جبھی وہ جلد سو گیا تھا، اب اگر وہ اس کی یہ بے ترتیبی دیکھ لیتا تو زیمل کی کلاس لگ جانا تھی، وہ وضو کر کے لوٹا تو اسے بیگ سمیٹتے دیکھ کر پہلے تو حیران ہوا پھر جیسے سارا معاملہ سمجھ گیا، ایک دھیمی سی مسکراہٹ اس کے لبوں پہ رینگ گئی، سفید ٹراؤزر اور شرٹ میں جس پہ ریڈ ڈاٹس تھے، بکھرے بالوں سمیت وہ بے حد گھبرائی لگ رہی تھی، وہ سر جھٹکتے ہوئے نماز کے لئے نکل گیا، اس کے جانے کے بعد وہ خود بھی نماز میں مشغول ہو گئی، اس کے بعد اس نے لان میں آدھا گھنٹہ واک کی، واپس آ کر فریش ہو کر منہ ہاتھ دھویا، یونیفارم چینج کیا اور باہر آ گئی، اسی اثنا میں زرشام بھی اندر آ چکا تھا، وہ اس وقت جاگنگ سوٹ میں تھا جبھی ماتھے پہ پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں، زیمل نے فوراً بڑھ کر تولیہ اسے تھمایا، وہ چہرہ پونچھنے کے بعد صوفہ پہ بیٹھ گیا۔

''مارننگ۔'' وہ ہلکا سا مسکرایا اور پھر خود بھی چینج کرنے کے لئے بڑھ گیا، جب وہ لوٹا تو زیمل ڈریسنگ ٹیبل کے آگے کھڑی بالوں سے الجھ رہی تھی وہ تیزی سے اس کی طرف لپکا۔

''زیمل! کیا کرتی ہو؟ میرا انتظار تو کر لیا کرو۔'' اس نے زیمل کے ہاتھ سے ہیر برش لے لیا اور اسے اسٹول پہ بٹھا کر خود اس کے بال سلجھانے لگا، اس کے شانوں سے نیچے آتے سنہرے ریشم کے لچھے اس کے ہاتھوں میں س رہے تھے، وہ بڑی احتیاط اور توجہ سے سلجھانے کے بعد اب اونچی سی پونی ٹیل بان رہا تھا، یہ بھی زیمل کا بڑا عجیب سا مسئلہ تھا، اس کے ساتھ تو مسائل کا انبار تھا، پہلی بار ج زرشام نے اسے یوں اپنے بال کھینچ کھینچ بناتے اور ساتھ ساتھ روتے دیکھا تو ہکا بکا ر گیا، پوچھنے پہ بتایا گیا کہ اسے خود سے با سلجھانے نہیں آتے، ''لال حویلی'' میں ایک ملازمہ خصوصی وقف کی گئی تھی صرف اس کے سنہرے گچھوں کو سمیٹنے کے لئے، وہ ساری تفص جان کر ایک طویل سانس لے کر رہ گیا تھا کہ ا کے سوا کر بھی اور کیا سکتا تھا پھر اس کے ہاتھ برش لے کر خود سلجھانے لگا اور اس کے بعد معمول بنا گیا، اگر باوجود اس روٹین میں کو چینج آ جاتا تو وہ اپنے بال صحیح معنوں میں نو کھسوٹ ڈالتی تھی۔

بال ٹھیک کروانے کے بعد سر پہ اسکارف لینے لگی پھر بیگ کندھوں پہ ڈالا اور زرشام ساتھ نیچے آ گئی، ناشتے کی ٹیبل پہ وہ خود نا کرنے کے ساتھ ساتھ اسے بھی کرواتا رہا، ان کے جانے کا وقت ہو گیا، زیمل نے بیگ کی پچھلی سیٹ پہ پھینکا اور خود اس کے برابر آ کے بیٹھ گئی۔

''ٹیسٹ کی تیاری کیسی ہے؟'' اس گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے پوچھا۔

''اچھی ہے۔'' وہ زیر لب کچھ پڑھ رہی تھ زرشام نے اس کے معصوم چہرے پہ پھیلی ملاح کو دیکھا تو دل میں ایک ٹیس سی اٹھی تھی، ای معصوم لڑکی، ان ظالم رسموں کی وجہ سے اپنے والوں سے دور تھی، وہ جانتا تھا وہ اپنے اماں کو مس کرتی تھی، انہی سوچوں میں گم اس

یل کو اسکول کے گیٹ پر اتارا تو وہ نیچے اترنے سے پہلے اس کی طرف مڑی تھی۔

''آپ میرے لئے دعا کیجئے گا۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا، ڈونٹ وری۔'' نے تسلی دی۔

وہ سر ہلاتے ہوئے اسے خدا حافظ کہتے باہر گئی، وہ یونیورسٹی کی طرف مڑ گیا، وہاں پہ در نکل آنے والی مصروفیات نے اسے پہلی بار دیا کہ اسے زیمل کو اسکول سے پک کرنا تھا اسے یاد آیا تو اس نے سر پیٹ لیا، وہ ڈیڑھ لیٹ تھا، انتہائی فاسٹ ڈرائیو کرتے ہوئے اس کے اسکول پہنچا تو اسے دھچکا لگا، پٹھان یدار ادھر ادھر ٹہل رہا تھا اور اس کی کرسی پہ بیٹھی تھی بیگ گود میں رکھے، وہ دونوں میں منہ چھپائے زور زور سے رو رہی تھی، زی سے دروازہ کھول کر باہر آ گیا، اسکول کا ہی جا چکا تھا ورنہ وہ ریکارڈ سے اس کا فون غیرہ ڈھونڈ کر اسے گھر پہنچانے کا بندوبست کرتا، زرشام کو دیکھتے وہ تیر کی طرح اس کی لپکی تھی اور اسے سے لپٹ کر اور زور سے لگی وہ اسے تھپکتا ہوا چوکیدار کو اپنا نمبر نے لگا، پھر اس کا بیگ اٹھا کر ڈکی میں رکھا اسے ساتھ لگائے گاڑی کی طرف لے آیا، کا سارا راستہ وہ روتی آئی تھی، گھر آ کر اس کھانا بھی بمشکل دو سے تین لقمے لئے اور وہ شاید زرشام کے خوف سے پھر واپس کمرے لیٹ گئی، زرشام سے اس کے اسٹوڈنٹس کے لئے آ گئے تو وہ ادھر مصروف ہو گیا مگر کا سارا دھیان زیمل کی طرف ہی اٹکا رہا، ہوتے ہی وہ اوپر کی طرف بڑھا تھا، نوراں اسے بتا دیا تھا کہ وہ تب سے مسلسل کمرے ی تھی، جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو وہ باتھ روم سے باہر آ رہی تھی، ڈھلے ہوئے چہرے کے ساتھ اس کی متورم آنکھیں زرشام کو مضطرب کر گئیں۔

''زیمل ادھر آؤ۔'' وہ صوفہ پہ بیٹھ کے بولا، وہ خاموشی سے اس کے پاس آ گئی، اس نے ہاتھ پکڑ کر ساتھ بٹھا لیا۔

''ناراض ہو؟'' زرشام نے پوچھا، زیمل کے لب کپکپائے مگر وہ نفی میں سر ہلا گئی۔

''رو کیوں رہی تھیں؟'' جواباً وہ خاموش رہی۔

''میں کچھ پوچھ رہا ہوں؟'' وہ چند لمحے اسی طرح بیٹھی رہی پھر نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا، خوفزدہ نظریں۔

''مجھے پتا ہے آپ مجھے ایک دن ایسے ہی بھول جائیں گے اور واپس نہیں لے کے آئیں گے، زیمل کی کسی کو ضرورت نہیں ہے، زیمل سب کے لئے بوجھ ہے، پہلے بابا اور لالہ کے لئے تھی انہوں نے پھینکا تو اب آپ کے لئے ہوں اور آپ بھی مجھے یوں ہی کسی دن چھوڑ دیں گے۔'' وہ ہچکیاں لے کر رو رہی تھی۔

زرشام گنگ سا رہ گیا تھا اس کی معمولی سی غلطی نے سائیکاٹریسٹ کی ساری محنت پہ پانی پھیر کر اسے پھر سے اسی State of mind میں دھکیل دیا تھا اسے خود پہ بے تحاشا غصہ آیا، اس نے خود کو سنبھالا اور اس کے شانے پہ بازو پھیلا کر اسے ساتھ لگا لیا۔

''ایسا کچھ نہیں ہے، انہوں نے تمہیں اس لئے نہیں چھوڑا اور نہ میں ایسا کروں گا، فضول باتیں مت سوچا کرو۔'' اس نے زیمل کی پیشانی پہ گرے سنہرے بال سمیٹے اور نرمی سے اس کی پیشانی کو چوما، اس کی سسکیاں رک گئیں۔

''میں تمہیں کبھی نہیں چھوڑوں گا۔'' اس

نے وعدہ کیا تھا۔
''اور کبھی لیٹ بھی نہیں آئیں گے؟'' اس نے یقین دہانی چاہی۔
''ہاں، نہیں آؤں گا۔'' اس نے یقین دلایا۔
''اور تم بھی مجھ سے ناراض ہو کر اگر روئیں نا تو بہت ماروں گا۔'' اس نے دھمکایا وہ مسکراتے ہوئے اس کے ساتھ لگ گئی۔
''چلو اٹھو، فورٹریس، جوائے لینڈ میں انجوائے کرواتے ہیں تمہیں۔'' اس نے کہا تو وہ خوشی سے اچھل پڑی۔

ایسے ٹوٹا ہے تمناؤں کا پندار کہ بس
دل نے جھیلے ہیں محبت میں وہ آذار کہ بس
اک جھونکے میں زمانے میرے ہاتھوں سے گئے
اس قدر تیز ہوئی وقت کی رفتار کہ بس

☆☆☆

رات تاریک اور سرد تھی، زیمل بیڈ پہ لیٹی ہوئی تھی اور اس سے ایک فٹ کے فاصلے پر دوسرا ذی نفس وہ خود تھا فاصلہ آج بھی قائم تھا، یہ کبھی ختم نہیں ہو سکا تھا کیونکہ اسے ختم کرنے کی کوشش ہی نہ کی گئی تھی جبکہ اس کا وجود ایک نو بالغ لڑکی سے ایک نوخیز دوشیزہ کے روپ میں ڈھل چکا تھا۔

وہ اس وقت رو رہی تھی، آنسو بے آواز اس کی سنہری آنکھوں سے گر رہے تھے اور اس سے ایک فٹ کی دوری سے لیٹا وجود بے خبر تھا، کیا اس دکھ سے بڑا کوئی دکھ تھا؟ اس کا سینہ جل اٹھا، لیکن وہ خود زمہ دار تھی اس سارے حالات کی، اس نے اس ستارہ مہرباں کو خود بدگمانی اور بے اعتمادی کی سیاہی میں ڈبو دیا تھا۔

کتنے دن گزر گئے تھے وہ اس سے بات نہیں کرتا تھا اگر اس میں زرشام سے نظریں ملانے کی ہمت نہ تھی تو وہ بھی اس کے چہرے کو نہ دیکھتا تھا، جب بات برداشت سے باہر ہو۔۔۔ تو وہ بیڈ سے نیچے اتر گئی، وہ نہیں چاہتی تھی ۔۔۔ اس کے رونے کی آواز سنے، جبھی تیزی ۔۔۔ کمرے سے نکل گئی۔

اس نے لان میں ٹھنڈی اور نم گھا۔۔۔ گرتے ہوئے ان سارے لمحوں کو یاد کیا ج۔۔۔ ان دونوں کے بیچ آئے تھے، محبت ۔۔۔ مسکراتے اور دل میں خوشی بھر دینے والے ۔۔۔ صرف چند لمحے تھے اس کے کاسۂ دل میں ۔۔۔ چند، جب وہ روتی ہوئی زیمل کو ساتھ لگ۔۔۔ ڈانٹتا اور آئندہ کبھی نہ رونے کا وعدہ لیتا، ۔۔۔ کبھی وفا نہ کر سکی، جب عیدین پہ وہ نما۔۔۔ پڑھنے کے بعد لوٹتا تو پہلے سے لان میں اس ۔۔۔ انتظار میں ٹہل رہی ہوتی زیمل دوڑ کے اس ۔۔۔ سینے سے لگ جاتی وہ اسے نرمی آمیز محبت ۔۔۔ تھپکتا اور اس کی پیشانی چوما کرتا اور یہ موقع ۔۔۔ میں بس دو ہی بار آتا، تیسرا تب جب اس ۔۔۔ پوزیشن لی، کوئی ڈیبیٹ کمپٹیشن جیتا، کوئی ۔۔۔ کمپٹیشن جیتا تب جب وہ اس کی طرف ۔۔۔ وکٹری کا نشان بناتا، اس کا دل خوشی کے ۔۔۔ سے منور ہو جاتا۔

آج اس کی زندگی جیسے انہی کو یاد کر ۔۔۔ سی گئی تھی، رات بتدریج گہری ہو رہی تھی ۔۔۔ ویسے بھی تاریکی سے ڈرتی تھی جبھی خود ۔۔۔ کے آنسو پونچھتی اندر کی سمت بڑھ گئی، ۔۔۔ مخصوص جگہ پر لیٹتے ہوئے اس نے سر میں ۔۔۔ درد کو یکسر نظر انداز کر دیا تھا، تھکن کے با۔۔۔ گہری نیند میں جلد ہی چلی گی مگر وہ منحوس ۔۔۔ آج پھر اس کے پیچھے تھے، تاریکی گہری ۔۔۔ اور خوف کا گہرا احساس اور دور تک پھیلی ۔۔۔ تنہا، وہ چیخ رہی تھی، بھاگ رہی تھی کسی ۔۔۔ کے شانے پہ ہاتھ رکھا تو وہ چلاتی ہوئی اٹھ۔۔۔

''زیمل! کیا ہوا ہے؟'' وہ اس کے شانے پہ ہاتھ رکھے پوچھ رہا تھا، وہ گہرے گہرے سانس لیتی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
''پھر کوئی برا خواب دیکھا؟'' اس کا لہجہ فکر مند تھا وہ گھٹنوں پہ سر رکھ کر رونے لگی۔
''بہت برا خواب ہے، مجھے لگا میں تنہا ہی ہوں، بھاگ رہی ہوں اور وہاں بہت اندھیرا تھا، مجھے بہت ڈر لگ رہا تھا، میں اکیلی تھی، میں نے آپ کو بہت آوازیں دیں مگر آپ کہیں نہیں تھے، آپ نہیں آئے، آپ نے مجھے تنہا چھوڑ دیا۔'' اس کے لہجے میں کرب تھا شکوے تھے۔
''نہیں، میں تو تمہارے پاس ہوں۔'' اس نے زیمل کو تسلی دی، اس کی آواز نے زیمل کو چابک کی سی ضرب لگائی وہ تڑپ کر سیدھی ہوئی، چند لمحے یک ٹک اس کی طرف دیکھتی رہی پھر دوڑتی ہوئی جا کر اسٹڈی روم میں بند ہو گئی، وہ ساکت بیٹھا رہ گیا۔

☆☆☆

دن اور رات کا چکر جاری تھا، زندگی بھاگتی جاتی تھی، موسم بدلتے تھے، ایک سنہری بہار میں اس نے اپنے رائٹنگ ٹیبل سے سر اٹھا کر سوئی ہوئی زیمل کو دیکھا، اب وہ بڑی ہو گی تھی، ایک ٹین ایجر بلکہ سویٹ سکسٹین کی لڑکی، میٹرک کی اسٹوڈنٹ وہ بہت بدل گئی تھی، ہر وقت ہنستی کھلکھلاتی، اس پہ دھونس جماتی پر اعتماد سی زیمل جس نے گھر کے کونے کونے کو اپنے ہاتھوں سے سجایا تھا، کبھی کبھی وہ بڑی مدبر بن کے اسے مشورے دیتی تو وہ ہنس دیتا۔

ذہین تو وہ تھی ہی مگر زرشام نے اس کی صلاحیتوں کو پالش کر دیا تھا، وہ اس سے بے حد اٹیچ تھی، وہ اس کا سب کچھ تھا بلکہ شاید زیمل کے سارے رشتے اسی کی ذات میں یکجا ہو گئے تھے، ایک باپ کی طرح پر شفق، ماں کی طرح فکر مند، بہن کی طرح اس سے ڈھیروں باتیں کرنے والا اور ایک بھائی کی طرح اس کی حفاظت کرنے والا اور سب سے بڑھ کر اس کا پیارا دوست، مگر صرف وہ اس کا شوہر نہیں تھا۔

☆☆☆

وہ صبح کے لئے لیکچر تیار کرنے کے بعد بستر پہ آ گیا، وہ بے خبر سوئی تھی، ایک ہاتھ گال کے نیچے دھرے دوسرا تکیے پہ رکھے، اس نے لحاف اس پہ درست کر دیا اور خود بھی لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں، اس کی آنکھوں میں ہلکی ہلکی نمی تھی، اسے زیمل کے حوصلے پر حیرت ہوتی تھی وہ اس کے سامنے اپنے والدین یا لالہ کا نام بھی لیتی تھی جبکہ وہ تو اندر ہی اندر ٹوٹ گیا تھا، اس قدر محبت کرنے والا باپ جان چھڑکتی ماں اور قدرے دور دور رہتی بہن، ہر رات وہ سوچتا تو چند لمحوں کے لئے دل رک سا جاتا تھا ''قصر گل'' نے اسے چھوڑ دیا تھا، اسے بھلا دیا تھا، صرف اس جرم کی پاداش میں جو اس سے سرزد ہی نہ ہوا تھا، کیا کیا تھا آخر اس نے؟ صرف ایک بے سہارا مظلوم اور معصوم و بیگناہ لڑکی کو سہارا دیا تھا اور کیا کیا تھا؟ بلکہ سہارا بھی اس لئے دیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ایک مقدس رشتے میں بندھ گئی تھی، خواہ کم عمر ہی سہی مگر بہر حال وہ شرعی لحاظ سے میاں بیوی تو تھے، ایسی باتوں کو سوچتے ہوئے وہ سو گیا مگر اس کی نیند بڑی بے چین سی تھی، صبح وہ اٹھا تو سر بوجھل سا تھا، اس کا دل سخت گھبرا رہا تھا، یونیورسٹی میں اس نے دو کلاسیں لیں اور اپنے آفس میں آ گیا، ایک گلاس گلوکوز پی کے بھی اس کا دل معمول پہ نہ آ سکا تھا، اسی دوران اس کا سیل بج اٹھا۔
''بابا کی کال۔'' وہ اچھل پڑا، فوراً کال پک کی مگر چھوٹتے ہی جو خبر انہوں نے سنائی

حیران کن اور دردناک ہونے کے ساتھ ساتھ جان نکالنے والی بھی تھی۔

''گل افشاں ملک کی ڈیتھ ہوگئی تھی۔'' اس نے چکراتے سر کے ساتھ سر کرسی کی بیک سے ٹکا دیا، کچھ دیر بعد جب اس کی طبیعت نارمل ہوئی اور حواس قابو میں آئے تو اسے احساس ہوا وہ رو رہا تھا، اس نے گھر فون کر کے زیمل کو بتایا وہ رات تک لوٹ آئے گا ضروری کام ہے، وہ تفصیل پوچھتی رہ گئی مگر اس نے فون بند کر دیا، کچھ دیر بعد اس کی گاڑی گاؤں کی طرف بڑھ رہی تھی، قریباً ڈھائی سال بعد وہ گاؤں آیا تھا، ایک ہجوم بیکراں تھا اسے پرسہ دینے والوں کا، لوگوں کا خیال تھا کہ وہ اپنی بیوی کو بھی لائے گا، مگر انہیں مایوسی ہوئی کیونکہ وہ اکیلا تھا، دوسری طرف تائب چوہدری اور گل رعنا بھی آئے تھے مگر انہیں ''قصر گل'' کی دہلیز پار کرنے کی اجازت نہ دی گئی تھی، روتی مچلتی گل رعنا کو بڑی مشکل سے تائب نے سنبھالا اور واپس جیپ میں بٹھا دیا تھا اور وہ لوٹ گئے۔

زرشام ماں کی میت کو کندھا دینے آیا تھا اور اس فریضے سے فارغ ہو کر وہ سب واپس آئے تو وہ باپ کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

''چلتا ہوں بابا سائیں!''

''تمہاری ماں کی خواہش تھی کہ تمہیں یہاں آنے کی اجازت دے دوں مگر یاد رکھنا اس میں وہ لڑکی شامل نہیں ہے، تم آ سکتے ہو مگر اس کے بغیر۔'' ان کے لہجے کی رعونت اب بھی قائم تھی۔

''بے فکر رہیے میں بھی نہیں آؤں گا، اس مہربانی و عنائیت کا شکریہ۔'' اس نے زخمی لہجے میں کہا۔

''مرضی ہے تمہاری۔'' وہ پھنکارا اٹھے۔

زرشام کی آنکھیں جل اٹھیں، اپنے اتنے پیارے سے باپ کا یہ روپ والفاظ برداشت کرنا بہت مشکل تھا، اسے بے حد تکلیف ہوئی تھی۔

''آپ کو ایک بات بتاؤں؟ مجھے سمجھ نہیں آتی تھی کہ مجھے یہاں آ کر گھٹن کیوں ہوتی ہے؟ مگر آج مجھے اس کا سبب سمجھ میں آ گیا ہے، یہاں آپ جیسے لوگ ہیں جو دوسروں کو حقیر کیڑوں سے بھی کم تر سمجھتے ہیں، جو خدائی لہجے میں بات کرتے ہیں، آپ میں اور سلطان چوہدری میں کوئی فرق نہیں ہے، وہ سب کچھ کھلم کھلا کرتا ہے اور آپ نے اپنے اوپر اچھائی کا لبادہ چڑھا لیا، سچ کہتے ہیں۔''

''Affection shows human mentality but, Situation shows human reality۔''

''اور آپ کو پتا ہے۔''

''You are nothing just fake۔'' وہ نفرت سے کہتا واپس مڑ گیا، سارا رستہ وہ روتا ہوا آیا تھا، اس کا قصور صرف یہ تھا کہ وہ ایک ''انسان'' تھا اور اس نے انسانیت کو اہمیت دی تھی، رات دس بجے کے قریب وہ گھر پہنچا تو تیز بخار میں پھنک رہا تھا، زیمل اسے دیکھتے ہی چونک گئی وہ سیدھا بیڈ روم کی طرف بڑھا تھا، وہ اس کے لئے چائے لے کر اندر آئی تو اسے بیڈ پہ بے سدھ پڑے دیکھ کر گھبرا سی گئی، بڑھ کر اس کا ماتھا چھوا تو جھٹکا لگا، اسے تیز بخار تھا۔

اس نے زبردستی اسے چائے کے ساتھ بسکٹ کھلائے اور ساتھ میں میڈیسن دی مگر وہ پھر بھی بے چینی سے سر پٹخ رہا تھا، سر درد کی پرابلم اسے اکثر ہوتی تھی، زیمل اسے کتنی بار کہہ چکی تھی کہ وہ اپنی آئی سائیٹ چیک کروائے مگر وہ ما

ہی نہ تھا، وہ دیر تک بیٹھ کر اس کا سر دباتی رہی۔

اگلے دو دن اس کی حالت یہی رہی مگر اس نے زیمل کو اصل حقیقت نہیں بتائی تھی، پھر بتدریج وہ سنبھل گیا، مگر ماں کو کھونے کے بعد اس کے دل کا ایک گوشہ ہمیشہ کے لئے ویران ہو گیا، اس کے ذہن سے ''اپنے گھر'' کا خاکہ مٹنے لگا، وہ اندر سے کچھ اور ریزہ ریزہ ہوتا رہا اور وقت بیتتا رہا، زندگی چلتی رہی اس کا تو کام ہی چلنا ہے۔

☆☆☆

یہ ''ملک ہاؤس'' کے خوبصورتی سے سجے ہوئے سیٹنگ روم کم لاؤنج کا منظر تھا، ایک ترتیب سے لگی خوبصورت تصاویر کیا تھیں ایک Chronology تھی، زیمل اور زرشام کی، چودہ سال کی زیمل سے لے کر بیس سال کی زیمل کی اور زرشام کی ایم فل سے پی ایچ ڈی تک کا سفر ان تصاویر میں یکجا تھا، ساتھ ساتھ مختلف ڈیٹس اور ایونٹس کی تفصیل بھی رقم تھی۔

زیمل کی شیلڈز اور میڈلز لیتے ہوئے کم و بیش بارہ تیرہ تصاویر تھیں، زرشام کے ساتھ مسکراتے ہوئے مختلف مقامات پر، کبھی فورٹریس پر، کبھی زو تو کبھی کسی ریسٹورنٹ میں ڈنر ٹیبل پر، کسی ڈیبیٹ کمپٹیشن کی تو کبھی کسی فنکشن کی کمپیئرنگ کی، وہ چھائی ہوئی تھی، زرشام کے ساتھ مختلف مواقع کی تصاویر، عیدین کی، سالگرہ کی اور دیگر، ہر تصویر پہلے سے بڑھ کر تھی، سب سے بڑھ کر وہ آخری انلاج تصویر تھی جس میں زیمل اور زرشام ساتھ ساتھ تھے، زیمل ایک خوبصورت سفید لباس میں ملبوس تھی اور اس کے ساتھ کھڑا زرشام بلیک ڈنر سوٹ میں تھا، تصویر کی سب سے نمایاں چیز زیمل کے دائیں کندھے پہ گرے بال تھے جو ایک طرف کو سمیٹ کر نیچے لائے گئے تھے بال کیا تھے سونے میں ڈھلا سنہرا آبشار تھا جو کندھے سے بہتا نیچے تک آ رہا تھا۔

وہ ایک پرفیکٹ تصویر تھی اور وہ دونوں بھی، لاؤنج میں کھڑا ذی نفس جب اس آخری تصویر کو بھی دیکھ چکا تو اسے اپنے پیچھے آواز سنائی دی۔

''جی! کس سے ملنا ہے؟'' زیمل نے پوچھا، وہ مڑا تھا اور اسے دیکھ کر جیسے زیمل کا سانس سینے میں ہی اٹک گیا۔

وہ اس ہستی کو کیسے بھول سکتی تھی؟ اس کے لاشعور میں آج بھی وہ خوف موجود تھا اور کتنی مشکلوں سے وہ اس خوف پہ قابو پا سکی تھی اور وہ ''خوف'' آج مجسم صورت اس کے سامنے کھڑا تھا وہ بے ساختہ ایک قدم پیچھے ہٹی۔

''اس کے سامنے ''زوریز ملک'' کھڑے تھے۔''

☆☆☆

وقت کچھ اور آگے سرکا تھا، اب زیمل کالج گرل تھی، نیکھی، چلبلی اور نٹ کھٹ، نت نئے تجربے کرنے کی شوقین، چاندنی راتوں کی دیوانی، بارش کے لئے پاگل اور سرد موسم کی دعائیں مانگتی، جس کی کھنکتی ہنسی، رائٹنگ ٹیبل پہ جھکے ہوئے زرشام کو بہت چونکا دیتی تھی، اسی سال اس نے پی ایچ ڈی کی تھی، ڈرامہ میں، اب وہ اس سے ضدیں کرتی تھی اور اکثر ہی اپنی بات منوانے میں کامیاب ہو جاتی تھی، گریجویشن میں آ کر تو اس کے پر پرزے زیادہ ہی نکل آئے تھے ورنہ وہ بنیادی طور پر بڑی سادہ و معصوم سی تھی اور یہ بلاشبہ کالج کے آزاد ماحول کا ہی اثر تھا۔

آج کل تو اس نے زرشام سے ایک عجیب سی ضد لگائی ہوئی تھی، وہ اپنے بال کٹوانا چاہتی تھی جس کے لئے وہ قطعاً رضامند نہ تھا، وہ تو اس کے بالوں کا دیوانہ تھا۔

"مگر کالج میں سب لڑکیوں نے کٹنگ کروائی ہوتی ہے۔" وہ جھلا کر بولی۔

"مگر تم سب لڑکیوں جیسی نہیں ہو۔" اس نے گویا بات ہی ختم کر دی۔

"مجھے پتا ہے۔" وہ سخت آف موڈ کے ساتھ اٹھنے لگی۔

"بال کٹوانے سے کیا ہوگا؟" وہ بھی جھلا کے بولا۔

"میرا دل چاہتا ہے میں بھی سیلون جاؤں، وہ سب کروں جو ساری لڑکیاں کرتی ہیں مگر نہیں، مجھے اس کا حق نہیں، آپ تو چاہتے ہیں میں سانس بھی آپ کی مرضی سے لوں۔" وہ تلخی سے بولتی باہر نکل گئی۔

وہ حیرت زدہ سا بیٹھا رہ گیا، یہ زیمل تھی؟ ناقابل یقین سا لگتا تھا؟ یہ کیا ہو گیا تھا اسے؟ یہ کس راہ کی مسافر بننا چاہتی تھی وہ؟ چند دن ہی گزرے تھے جب اس نے ایک اور ایشو اٹھا لیا۔

"مجھے ڈرائیونگ سیکھنی ہے۔" وہ اس کے عجیب و غریب مطالبے پہ حیران رہ گیا مگر جب بولا تو لہجے میں شدید غصہ اور تحکم تھا۔

"یہ تم مجھ سے کس قسم کی فرمائشیں کرنے لگ گئی ہو آج کل؟ دماغ درست ہے نا تمہارا؟ اگر تم یہ چاہتی ہو کہ میں تمہیں اجازت دے دوں اور تم جینز پہن کر بال کھول کر ڈرائیو کرو تو یہ ناممکن ہے، اینڈ کسن زیمل! مجھے آج کے بعد یہ بتانے کی کوشش مت کرنا کہ تم کیا چاہتی ہو؟ تم صرف وہی کرو گی جو میں چاہوں گا، از اٹ کلیئر؟" وہ کہہ کر باہر نکل گیا۔

وہ سن سی بیٹھی رہ گئی، یہ کس لہجے میں بات کر کے گیا تھا وہ؟ اسی رات جب وہ بیڈ پہ نیم دراز کوئی کتاب پکڑے مصروف تھا، زیمل کے بگڑے زاویے دیکھ کر اسے آواز دے دی۔

"زیمل! یہاں آؤ۔" وہ خاموشی سے اٹھ کر چلی آئی۔

"ناراض ہو؟" اس نے نرمی سے اس کے شانے میں ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

"نہیں۔" وہ سرد مہری سے بولی۔

"مگر مجھے تو لگ رہی ہو؟" اس نے زیمل کا چہرہ اوپر کرنا چاہا جسے اس نے سختی سے جھٹک دیا۔

"رہنے دیجئے یہ دکھاوے کی فکر۔" وہ چبا چبا کے کہتی باہر نکل گئی، اب کی بار سن ہونے کی باری زرشام کی تھی، وہ بے حد حساس تھا اور اس کی یہ اوور سنسٹیویٹی ہمیشہ ہی اس کے لئے مسئلہ بنی تھی، اگلے دن بھی اس نے زیمل کی اتنی ٹینشن لی کہ اس کا بی پی شوٹ کر گیا، ایک گھنٹہ ڈاکٹر دانش کے ہاسپٹل میں گزار کر آیا تو بے حد تھکا اور نڈھال تھا، مگر ابھی ایک اور قیامت اس کی منتظر تھی۔

گاڑی اندر لے جاتے ہی چوکیدار نے اسے بتایا کہ ابھی ابھی اس سے ملنے کے لئے کوئی آیا ہے اور وہ اندر کی طرف بڑھا تو لاؤنج میں کھڑا مہمان اور سیڑھیاں اترتی زیمل ایک ساتھ اس کی نظر میں آئے تھے، دونوں کی نظر ایک ساتھ ہی آنے والے پہ پڑی اور دونوں ہی ٹھٹھک گئے۔

آنے والا "تائب چوہدری" تھا، زرشام اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

"زیمل! اوپر جاؤ واپس۔" اس نے سختی سے کہا، وہ اس کے بازو پہ ہاتھ ٹکا کر دھیمی سی آواز میں کرلائی تھی۔

"زرشام! میرے ...... لالہ...... لالہ۔"

اس سے پہلے کہ تائب کچھ بولتا، زرشام غرا ہی تو اٹھا تھا۔

"زیمل! میں نے کہا جاؤ، سنا نہیں تم نے؟" اس کی سرخ آنکھیں اور اجنبی لہجہ، زیمل نے ہراساں نگاہوں سے اسے دیکھا اور تیزی سے واپس سیڑھیاں چڑھ گئی، تائب جواب تک خاموش تھا پہلی بار بولا تھا۔

"تم نے تو کمال کر دیا زرشام!" وہ توصیفی انداز میں بولا اشارہ ان تصاویر اور ان سے متعلق کارناموں سے تھا۔

"تو آپ آپ کون سا کمال دکھانے آئے ہیں؟" زرشام کا لہجہ طنز میں ڈوبا ہوا سرد تھا۔

"دیکھو! میں ایک بہتر تعلق چاہتا ہوں، جو غلطیاں ہو گئیں، انہیں بھلا کر بھی ہم نئے تعلق کا آغاز کر سکتے ہیں نا۔" تائب کا لہجہ نرم تھا۔

"مگر مجھے آپ سے کسی قسم کا کوئی تعلق نہیں رکھنا، آپ جا سکتے ہیں۔" اس نے بے رحم لہجے میں کہا اور سیڑھیاں چڑھتا گیا، تائب ساکت کھڑا رہا پھر تھکے تھکے قدموں سے باہر کی سمت بڑھ گیا۔

زرشام کمرے میں پہنچا تو وہ دونوں بازو گھٹنوں کے گرد لپیٹے زور زور سے رو رہی تھی، اسے دیکھتے ہی وہ چیل کی طرح اس پہ جھپٹی تھی اور ایک عجیب وحشت کے عالم میں اسے جھنجھوڑنے لگی۔

"آپ انسان نہیں درندے ہیں، میں نفرت کرتی ہوں آپ سے۔" وہ حلق کے بل چلائی تھی۔

"شٹ اپ زیمل!" وہ دھاڑا تھا مگر وہ ذرا بھی نہیں ڈری۔

"قید کر کے رکھنا چاہتے ہیں مجھے؟ ایسا کیجئے ایک پنجرہ بنوایئے اور اس میں ڈال دیجئے مجھے، شاید اسی طرح آپ کی انا کو تسکین مل سکے۔" وہ زہر اگل رہی تھی۔

اپنے جنون میں وہ یہ بھول گئی کہ زرشام کا رنگ کیسے زرد پڑ رہا تھا، وہ کھڑے کھڑے لڑکھڑایا تھا۔

"آپ چاہتے ہیں میں بس آپ تک محدود ہو جاؤں، آپ کی مرضی سے اٹھوں، آپ کی مرضی سے سوؤں، دن کو رات کہوں، آپ کی پسند سے کپڑے پہنوں، آپ کی پسند کا کھانا کھاؤں، میں خود کیا ہوں؟ زرشام ملک! کیا حیثیت ہے میری؟ خریدا نہیں تھا آپ نے مجھے؟ مگر رویہ آپ کا ایسا ہے جیسے میں آپ کی باندی ہوں اور اب آپ نے مجھے لالہ سے بھی نہیں ملنے دیا، کیوں؟ اگر آپ کی بہن ان کے ساتھ بھاگ گئی تھی تو اس میں میرا کیا قصور تھا؟" وہ رو رہی تھی اور زرشام کا دل بہت گہرائی میں جا کر ڈوبا تھا۔

"میں آپ سے نفرت کرتی ہوں، سنا آپ نے، شدید نفرت، آپ نے مجھے ہر ایک سے دور کر دیا، آپ نے مجھے تنہا کر دیا، صرف خود تک محدود کر دیا ہے؟ کیوں چاہتے ہیں آپ کو جو آپ کو غلط لگتا ہے وہ مجھے بھی غلط لگے؟ کیوں چاہتے ہیں آپ کہ میں دنیا آپ کی نظر سے دیکھوں، اصل بات پتا ہے کیا ہے؟ آپ ایک خود پرست اور خود پسند انسان ہیں، آپ چاہتے ہیں میں ہر وقت آپ کی عظمت کے گن گاتی رہوں کیوں؟ اصل میں آپ خود کو دیوتا سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ میں بس آپ کی داسی بن کر رہوں اور بس...... مجھے برابری کا درجہ چاہیے زرشام! مجھے میرا حق چاہیے، خدا کے لئے، مجھے انسان سمجھیں، آپ......" وہ چیختی چلاتی آخر میں مدھم پڑ گئی تھی اور وہاں تھا ہی کب اس کی سانس رک رہی تھی، یوں لگ رہا تھا کہ زیمل نے زہر میں بجھا کوئی خنجر اس کے سینے میں گاڑ دیا تھا، اس کے سر درد میں بے پناہ اضافہ ہو گیا، وہ ہلکا سا لڑکھڑایا اور اگلے

ہی پل دھڑام سے نیچے گرا، اس نے دھندلائی ہوئی نظر سے چاروں طرف دیکھا تھا ہر چیز مدھم اور گھومتی ہوئی سی تھی، اس کا پورا جسم جیسے جلتا آبلہ بن گیا تھا اور اگلے ہی لمحے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔

☆☆☆

بہت جدا ہے اوروں سے میرے درد کی کیفیت فراز
زخم کا کوئی نشان نہیں اور تکلیف کی کوئی انتہا نہیں

اسے شدید ترین نروس بریک ڈاؤن ہوا تھا، وہ ایک ہفتہ ہاسپٹلائز رہا تھا اور جب سے گھر آیا تھا مسلسل خاموش تھا، آج زوریز ملک آئے تو وہ اپنی اسٹڈی میں تھا، زیمل تو انہیں دیکھتے ہی واپس بھاگ گئی تھی۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ دونوں میں کیا بات ہوئی تھی مگر اس نے ٹیرس سے زوریز ملک کو واپس جاتے دیکھا تھا، ان کے جھکے کندھے بتاتے تھے کہ وہ ناکام گئے تھے۔

آج دسمبر کی آخری شب تھی، صبح نیا سال ہو رہا تھا، پتا نہیں دسمبر کیوں اتنا اداس تھا؟ لیکن صبح کا دن بہت خاص تھا، صبح زرشام کی سالگرہ تھی، وہ دل میں ٹھان چکی تھی کہ صبح وہ اسے ہر حال میں منائے گی، خواہ اس کے لئے کچھ بھی ہو جائے، اگلی صبح زرشام کو اپنے سائیڈ ٹیبل پر ایک وشنگ کارڈ ملا تھا، ساتھ میں ایک گلاب تھا، ادھ کھلا خوبصورت سرخ گلاب، اس نے کارڈ کھول لیا۔

یکم جنوری!
نیا سال اور آپ کی سالگرہ
مبارک ہو۔

تمہارا عشق صدی دو صدی تو پا لیں گے
ابھی اتنی سکت تو ہماری چاہ میں ہے

وہ خالی خالی نظروں سے شعر کو دیکھتا رہا پھر دونوں چیزیں اٹھا کر ''زیمل'' اپنے دراز میں ڈال کر اٹھ گیا، آج سے وہ یونیورسٹی دوبارہ جوائن کر رہا تھا۔

☆☆☆

اس نے ایک اضطراری نظر پورے کمرے میں دوڑائی اور مطمئن ہو کے نگاہ پھیر لی، سب کچھ مکمل تھا صرف زرشام کا انتظار تھا۔

وہ کمرے میں داخل ہوا تو حیران رہ گیا، پورے کمرے میں اندھیرا تھا، صرف کینڈل اسٹینڈ پہ موم بتیاں جل رہی تھیں، خوبصورتی سے سجا ٹیبل، کیک اور ریڈ روزز اس کی کمزوری تھے۔

''سرپرائز۔'' وہ چہکتی ہوئی آواز میں بولی اور لائٹس جلا دیں، پورے کمرے کی ڈیکوریشن بدلی ہوئی تھی۔

''تھینکس۔'' اس کے ہونٹ مسکرانے والے انداز میں پھیل گئے، وہ کوٹ اتارتا آگے بڑھ گیا، زیمل وہیں فریز سی ہو گئی، وہ اب ٹیرس پہ کھڑا تھا سلائیڈنگ ونڈو کھولے، وہ آہستگی سے اس کی طرف آئی، دھیرے سے اس کے سامنے کھڑے ہوتے ہوئے دونوں ہاتھ باہم جوڑ دیئے، وہ ٹھٹھک گیا۔

''مجھے معاف کر دیں زرشام! میں اس قابل نہیں تھی کہ آپ میرے لئے اتنا کچھ کرتے ہیں لیس احسان فراموش ہی نہیں ظالم بھی ہوں مگر آپ تو بہت اچھے ہیں، بہت اعلیٰ ظرف پلیز مجھے معاف کر دیں۔'' وہ رونے لگی آنسو قطرہ قطرہ اس کی سنہری آنکھوں سے گر رہے تھے اور زرشام کراہ کر رہ گیا وہ آج بھی بے خبر تھی کہ اسے زیمل کے آنسو کس قدر تکلیف دیتے تھے۔

''آپ مجھے برا بھلا ہی کہیں مگر مجھ سے بات تو کریں، مجھے خود سے نفرت ہوتی ہے جی چاہتا ہے مر جاؤں۔'' وہ اب بے حد جذباتی ہو رہی تھی اور اس نئے سال کی صبح زرشام نے سوچا۔

''آپ کا ہر قریبی شخص جلد یا بدیر آپ کو تکلیف دیتا ہے مگر اہمیت اس بات کی ہے کہ آپ کے نزدیک اہم کون ہے؟ شخص یا تکلیف؟'' اور اسے زیمل بہت عزیز تھی اور اپنے پیاروں کو کوئی بھی جھکانا پسند نہیں کرتا اس نے نرمی سے زیمل کے بندھے ہاتھ کھولے اور اسے ساتھ لگا لیا، وہ اس اعلیٰ ظرفی پہ جیسے زمین میں دھنس گئی تھی۔

''بس کرو زیمل! مت رو میری زندگی! تمہارے آنسو مجھے تکلیف دیتے ہیں۔'' اس نے نرمی سے کہتے ہوئے اس کے آنسو صاف کیے اور اس کی پیشانی پہ گرے بال سمیٹ کر اسے چوما، زیمل کے اندر تک ٹھنڈک اتر گئی۔

''تم ٹھیک کہتی ہو زیمل! تعلق برابری کی سطح پہ ہونا چاہیے میں دیوتا نہیں ہوں اور نہ تم داسی، اس لئے آؤ ان جھوٹی رسموں کو توڑ دیں، میں صرف تمہارا شوہر ہوں اور تم میری بیوی آج کے بعد صرف یہی تعلق ہماری پہچان ہو گا، نئے سال کے دن پرانی باتیں بھول جاؤ زیمل! آؤ ایک نئی زندگی کا آغاز کریں۔'' وہ اسے لئے اندر کی سمت بڑھ آیا۔

ماحول میں ایک لطیف ٹھنڈک تھی، موتیری اور پام کے درختوں کی مہک فضا میں چکرا رہی تھی اور ہوا چاند کے ساتھ مل کر عجیب سرگوشیاں کر رہی تھی جنہیں سن کر شاخیں جھوم رہی تھیں۔

تجھے محتاط کرتا ہوں تیری لے میں جان لے لوں گا
ان اپنی جھیل آنکھوں کو کبھی پرنم کیا تو نے؟

وہ آہستگی سے بولتے ہوئے اس کی بھیگی متورم آنکھوں پر جھک گیا تھا۔

☆☆☆

گاڑی بڑی روانی سے سڑک پہ پھسل رہی تھی، زیمل نے ڈرائیو کرتے زرشام کو دیکھا اور بڑی قربان ہو جانے والی نگاہ سے دیکھا تھا، پھر اس کے لبوں پہ اک مسکراہٹ رینگ گئی، وہ جتنا باہر سے خوبصورت تھا اتنا ہی اندر سے بھی تھا، زیمل کے دل میں جیسے روشنیاں سی اتر آئیں تھیں، آج صبح ہی تو وہ اس سے کہہ رہا تھا۔

''زیمل! میں نے تائب کو بھی مایوس لوٹا دیا اور بابا کو بھی، مجھے ڈر لگتا ہے پتا نہیں زندگی کتنی مختصر ہے؟ اور ہم اسے نفرتوں اور جھگڑوں میں ہی گزار دیتے ہیں، کہتے ہیں نفرت کو ہزار مواقع دو کہ وہ محبت بن جائے مگر محبت کو ایک بھی موقع نہ دو کہ وہ نفرت بن سکے۔''

''آؤ زیمل! گاؤں چلیں، سب سے ملیں، آؤ، ہم نفرت کو محبت بننے کا موقع دیں۔''

اور اب وہ گاؤں جا رہے تھے جہاں زوریز ملک تھے جو اب صحیح معنوں میں بوڑھے ہو گئے تھے، تنہائی انہیں گھن کی طرح چاٹ رہی تھی دوسری طرف سلطان چوہدری تھے جو ہارٹ پیشنٹ تھے اور اوپن ہارٹ سرجری کروا چکے تھے جس کے ساتھ ہی ان کا ساری دشمنیاں اور نفرتیں بھی بہہ گئیں تھیں، تائب اور گل رعنا تھے جو اپنی زندگی میں بہت خوش تھے سوائے بچھڑ جانے والوں کے دکھ سوا اور کوئی غم نہ تھا انہیں۔

زیمل کو یقین تھا وہ کامیاب لوٹیں گے، بلکہ اسے زرشام پہ کامل اعتماد تھا وہ ستارہ مہرباں جس نے زیمل کی زندگی کندن بنا دی تھی اس کے پاس ایک گر تھا، اس کے پاس محبت تھی، وہ محبت جس کے بارے میں کہا جاتا ہے۔

محبت تو بادشاہ ہوتی ہے
جو کسی کو رعایا نہیں رکھتی
لیکن غلام ضرور بنا لیتی ہے

☆☆☆